تعمیر ملت

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ ، نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

راقم الحروف کو ایک بار ایک مسلم ادارہ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے اپنا قائم کیا ہوا "صنعتی مدرسہ" دکھایا جو ان کے وسیع مکان کے ایک حصہ میں واقع تھا۔ اس مدرسہ میں مسلم لڑکیوں کو کپڑے کی کڑھائی کا کام سکھایا جاتا تھا۔ پھر وہ مجھے ایک کمرے میں لے گئے۔ یہاں بڑی تعداد میں میز پوش رکھے ہوئے تھے جو پچھلے کئی سالوں میں لڑکیوں نے بنائے تھے۔ "دیکھئے کتنے اچھے ہیں یہ میز پوش" انھوں نے پھول دار ٹکڑوں کو دکھاتے ہوئے کہا "یہ ہماری لڑکیوں نے تیار کئے ہیں۔ مگر یہاں مقامی طور پر ان کا کوئی مارکٹ نہیں۔ آپ ان کو دہلی میں فروخت کرا دیں تو ہم اس کے پیسہ کو مدرسہ میں لگائیں اور اس کو مزید ترقی دیں۔"

یہ سادہ سا واقعہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے مسئلہ کو بہت خوبی کے ساتھ ممثل کر رہا ہے۔ ہم "سن مائیکا" کے دور میں "میز پوش" کی تجارت کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں زمانہ کے جدید حالات کی خبر نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا وجود آج کے زمانہ میں ایک قسم کی قدیم اشیا رکی دکان (Old Curiosity Shop) بن کر رہ گیا ہے جس کو وقتی طور پر خواہ کچھ خاص مزاج کے خریدار مل جائیں۔ مگر جدید دنیا میں اس کو کوئی غالب حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی —— ایک ایسے زمانہ میں جب کہ قومیں لیاقت اور امتیاز کے بل پر اپنی جگہ بنا رہی ہیں ہم مراعات اور ریزرویشن کا مطالبہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ جب کہ دوسرے لوگ سائنٹفک اسلوب میں اپنے "دین" کو پیش کر رہے ہیں، ہم شاعرانہ اور خطیبانہ اسلوب کا کمال دکھا رہے ہیں۔ جب کہ لوگ پر امن تدابیر کے ذریعہ اپنی جڑیں مستحکم کر رہے ہیں، ہم توڑ پھوڑ اور ایجی ٹیشن میں مصروف ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس سے معجزاتی نتائج برآمد ہوں گے۔

ملت کی تعمیر کے لئے پچھلے سو برس سے پر شور ہنگامے جاری ہیں۔ مگر ملت کا قافلہ ایک قدم بھی آگے بڑھا ہوا نظر نہیں آتا۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ملت کی تعمیر کا مطلب ہمارے یہاں یہ ہے کہ کسی نہ کسی خارجی گروہ کو اپنے مسائل کا ذمہ دار قرار دے کر اس کے خلاف تقریر و تحریر کا طوفان برپا کرتے رہنا۔ یہ واقعہ بار بار پیش آ رہا ہے کہ حالات ہمارے ایک "دشمن" کو ہٹا دیتے ہیں مگر اس کے بعد جو دوسرا آتا ہے وہ بھی ہمارے لئے اتنا ہی، بلکہ اکثر اوقات اس سے زیادہ برا ثابت ہوتا ہے جتنا کہ پہلا تھا۔ مگر ہمارے جوش میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں آتا کہ جو احتجاجی سیاست پہلے ہم ایک کے خلاف چلا رہے تھے، اب اس کو دوسرے کے خلاف چلانا شروع کر دیتے ہیں۔

اگر ہمیں زندہ رہنا ہے تو اس قسم کی منفی تدبیروں کو ہمیں چھوڑنا ہوگا۔ اپنی تعمیر آپ کرنی ہوگی۔ دوسروں کو ذمہ دار ٹھہرانے کے بجائے اپنے آپ کو اپنے پچھڑے پن کا ذمہ دار قرار دینا ہوگا۔ اپنے وقت اور پیسہ کو جلسوں اور کانفرنسوں میں برباد کرنے کے بجائے اس کو اپنی تعمیر و ترقی پر لگانا ہوگا۔ نعروں اور تقریروں کی سیاست کو چھوڑ کر خاموش عمل کی سیاست اختیار کرنا ہوگا۔ جو امکانات ضائع ہو چکے ان کا ماتم کرنے کے بجائے نئے مواقع کو استعمال کر کے اپنا سفر جاری کرنا ہوگا۔ خوش فہمیوں کی دنیا سے نکل کر حقائق کی دنیا میں اپنا مستقبل بنانا ہوگا۔ اس کے سوا اور کوئی چیز نہیں جو اسباب کی اس دنیا میں ہمیں زندگی عطا کرنے والی ہو۔ (۱۹ دسمبر ۱۹۷۸ء)

یہ الفاظ ایک صدی قبل کہے گئے تھے

۱۸۵۷ کے حالات کے ذیل میں مولانا سید حسین احمد مدنی لکھتے ہیں: "قصبہ تھانہ بھون میں حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے تیسرے خلیفہ مولانا شیخ محمد صاحب رہتے تھے۔ وہ علوم عربیہ کے باقاعدہ فاضل تھے۔ علمائے دہلی سے تمام نصاب علم ظاہر پڑھ چکے تھے۔ بدقسمتی سے مولانا شیخ محمد صاحب کی رائے یہ تھی کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا ہم مسلمانوں پر فرض تو درکنار موجودہ احوال میں جائز ہی نہیں۔ (چنانچہ تھانہ بھون میں اکابر علماء کا ایک اجتماع بلایا گیا جس میں مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی وغیرہ شریک ہوئے) اجتماع میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت ادب سے مولانا شیخ محمد صاحب سے پوچھا کہ حضرت کیا وجہ ہے کہ آپ ان دشمنان دین و وطن پر جہاد کو فرض بلکہ جائز بھی نہیں فرماتے تو انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے پاس اسلحہ اور آلات جہاد نہیں ہیں۔ ہم بالکل بے سروسامان ہیں۔ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا کہ کیا اتنا بھی سامان نہیں ہے جتنا کہ غزوۂ بدر میں تھا۔ اس پر مولانا شیخ محمد صاحب مرحوم نے سکوت فرمایا (نقش حیات، جلد دوم، ۱۹۵۴ء، صفحہ ۴۰)

ڈاکٹر محمد اقبال کے پہلے مجموعۂ کلام بانگ درا میں ایک نظم "نالۂ طائر بام" کے عنوان سے درج ہے۔ یہ نظم اقبال نے ۱۹۰۵ اور ۱۹۰۸ کے درمیان کسی وقت "طلبہ علی گڑھ کالج کے نام" لکھی تھی۔ اس نظم کا آخری شعر یہ تھا:

بادہ ہے نیم رس ابھی شوق ہے نارسا ابھی رہنے دو خم کے سر پہ تم خشت کلیسیا ابھی

مطلب یہ کہ انگریزوں سے سیاسی چھیڑ چھاڑ ابھی نہ کرو۔ کیوں کہ اس سے پہلے اور اس کے بعد جو ضروری صلاحیت درکار ہے وہ ابھی لوگوں میں پیدا نہیں ہوئی۔

انگریزوں کے ہندستان میں داخلہ کے بعد جب رہناؤں کے ایک بڑے طبقہ میں ان کے خلاف سیاسی جہاد کا جذبہ ابھرا تو اسی کے ساتھ اہل فکر کی ایک تعداد ایسی بھی موجود تھی جو اس کے خلاف تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ انگریزوں سے سیاسی جہاد ابھی قبل از وقت اور مضر ہے۔ ہم کو پہلے اپنے آپ کو مستحکم بنانا چاہئے۔ کیوں کہ اپنی موجودہ حالت کے ساتھ ہم زمانہ جدید کے سیلاب کے مقابلہ میں ٹھہرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اس سلسلہ میں یہاں دو رہناؤں کے اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں۔ ایک اقبال کا۔ دوسرے رشید رضا کا۔

ڈاکٹر اقبال نے رسالہ مخزن (اکتوبر ۱۹۰۴ء، مارچ ۱۹۰۵ء) میں دو قسطوں میں ایک مضمون شائع کرایا تھا۔ اس مضمون کا خلاصہ خود اقبال کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:

"اگر ہمیں اقوام عالم کے دفتر میں اپنا نام قائم رکھنا ضروری ہے تو اپنی نسلوں کی بہبودی کو بھی ایک موجود واقعہ تصور کرنا ہوگا۔ ایک زمانہ تھا جب کہ اقوام دنیا کی باہمی معرکہ آرائیوں کا فیصلہ تلوار سے ہوا کرتا تھا۔ مگر آج زندگی کا دارومدار اس کاٹھ کی تلوار پر ہے جو قلم کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔

مسلمانوں نے بالعموم یہ سمجھا ہے کہ تعلیم کا مقصد زیادہ تر دماغی تربیت ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ تعلیم کا اصل مقصد نوجوانوں میں ایسی قابلیت پیدا کرنا ہے جس سے ان میں باحسن وجوہ اپنے تمدنی فرائض اداکرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ جن قوموں نے تعلیم کے اس راز کو سمجھا وہ آج ترقی کے آسمان پر ہیں۔

پارسیوں کی تاریخ پر نظر ڈالو۔ ایک زمانہ میں وہ عظیم الشان قوم تھی۔ کیانی تہذیب و تمدن، شہنشاہ یزدجرد کے عہد میں عربی سواروں نے ختم کر دیا۔ مگر کیا یہ قوم صفحۂ ہستی سے مٹ گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قوم نے انقلاب کے اس مفہوم کو سمجھ لیا ہے جس کی سب سے بڑی خصوصیت صنعت و تجارت ہے۔ تجارت کا ایک کثیر حصہ ان کے ہاتھوں میں ہے اور یہی وجہ ان کے سنبھل جانے کی ہے۔

ان اعتبارات سے مسلمانوں کی حالت نہایت مخدوش نظر آتی ہے۔ یہ بدقسمت قوم حکومت کھو بیٹھی، صنعت کھو بیٹھی، تجارت کھو بیٹھی۔ اب وقت کے تقاضوں سے غافل اور افلاس کی تلوار سے مجروح ہو کر ایک بے معنی توکل کا عصا ٹیکے کھڑی ہے۔ حتٰی کہ ابھی تک ان کے مذہبی نزاعوں کا ہی فیصلہ نہیں ہوا۔ آئے دن ایک نیا فرقہ پیدا ہوتا ہے جو اپنے آپ کو جنت کا وارث سمجھ کر باقی تمام لوگوں کو جہنم کا ایندھن قرار دے دیتا ہے"۔

علامہ رشید رضا مصری ۱۳۳۰ھ (۱۹۱۲ء) میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کی دعوت پر ہندستان آئے تھے اس کے سالانہ اجلاس سے فارغ ہو کر وہ دارالعلوم دیوبند گئے۔ وہاں انھوں نے ایک تقریر کی جس کے ایک حصہ کا ترجمہ یہ ہے:

"اشاعت اسلام کے دو طریقے ہیں۔ ایک، اسلام کے احکام و ہدایات کا عام مسلمانوں تک پہنچانا، اسلام کی اشاعت کا دوسرا حصہ کافروں اور بت پرستوں سے متعلق ہونا چاہئے۔ ہندستان میں صدہا قسم کے بت پرست ہیں۔ یہاں بتوں کو پوجنے والے، درختوں اور پتھروں کو پوجنے والے، چاند، سورج، ستاروں اور نہایت لغویات اور خرافات کو پوجنے والے بھی موجود ہیں۔ پس اگر دعاۃ اور مبلغین کی ایک مضبوط جماعت موجود ہو تو ان لوگوں میں اسلام کی اشاعت اس قدر سرعت کے ساتھ ہو سکتی ہے جو اس وقت ہمارے خیال میں بھی نہیں آ سکتی۔ ہمیں عیسائیوں کے مقابلے میں بہت زیادہ کامیابی ہو سکتی ہے۔

اس کے علاوہ ایک خاص بات اور ہے جو ہر ایک دور اندیش مسلمان کی توجہ کے لائق ہے اور وہ یہ کہ ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد غیر مسلموں کے مقابلہ میں اس قدر کم ہے کہ ان کی ہستی کو اس ملک میں ہمیشہ معرض خطر میں سمجھنا چاہئے۔ انگریزی حکومت نے جو کہ عقل اور عدل کی حکومت ہے، غیر مسلموں اور مسلمانوں کے درمیان موازنہ قائم کر رکھا ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ موازنہ کسی وقت ٹوٹ جائے تو آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ کیا نتیجہ ہوگا۔ غالباً مسلمانوں کا وہی حشر ہو گا جو اندلس میں ہوا تھا۔ اس لئے ایک جماعت ہم میں ایسی ہونی چاہئے جو ان شبہات کو رفع کرے جو اسلام پر عائد کئے جاتے ہیں۔ یہ شبہات جو موجودہ زمانہ کے علوم و فنون کی بنا پر پیدا ہو گئے ہیں، ان کا دور کرنا بہت ضروری ہے، مگر ان شبہات کو رفع کرنا بغیر فلسفۂ جدید کی واقفیت کے ناممکن ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس جماعت کے اشخاص فلسفۂ جدید

کے اہم مسائل سے واقفیت رکھتے ہوں ۔" روداد دار العلوم دیوبند ۱۳۳۰ھ (۱۹۱۲ء)

اوپر کے دونوں اقتباسات موجودہ صدی کے آغاز سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں ایسے مفکرین موجود تھے جنھوں نے مسلمانوں کو وقت کی دو اہم ضرورتوں کی طرف توجہ دلائی۔ انھوں نے بتایا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو جو چیز طاقت ور بنائے گی وہ جنگ و جدال نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ مسلمان ایک طرف جدید اقتصادی قوتوں پر قبضہ کریں۔ دوسری طرف اسلام کی توسیع و اشاعت کے لئے خاموش جدوجہد کریں۔ یہ دونوں کام اسی حالت میں ہو سکتے تھے جب کہ مسلمان سیاسی اور غیر سیاسی جھگڑوں سے بچ کر خالص تعمیری انداز میں ان کے لئے مصروف ہوتے۔ مگر جھگڑے کی سیاست میں ہماری بڑھی ہوئی دل چسپی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم کو اس قسم کے خاموش تعمیری کام کی طرف رغبت ہی نہ ہو سکی۔ ہم نے کام کی پوری ایک بہترین صدی صرف بے معنی قسم کی سیاست میں گزار دی۔ اور اب جب کہ ہم اپنی اس غفلت کی وجہ سے دوسرے انسانی قافلوں سے پچھڑ گئے ہیں، ہم نے اپنے لئے ایک اور مشغلہ تلاش کر لیا ہے: اپنے پچھڑے پن کا الزام دوسروں کو دے کر ان کے خلاف فریاد و احتجاج کرنا۔ ہم کو آج بھی نہ اپنی غلطی کا احساس ہے اور نہ دوبارہ اپنی غلطی کی تلافی کرنے کا۔

دوسروں سے پہلے اپنے کو جاننے کی ضرورت

اگست ۱۹۷۱ء میں راقم الحروف کو احمد آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک کارخانہ دار اپنا کارخانہ دکھانے کے لئے لے گئے۔ یہ ایک نوجوان تھے۔ انھوں نے انجینیرنگ کی ڈگری لی تھی اور اب اپنے والد کے قائم کئے ہوئے کارخانہ کو سنبھالنے اور اس کو ترقی دینے میں لگے ہوئے تھے۔

"اپنی تو (Limitations) آجاتی ہیں مینجمنٹ سائڈ پر،" انھوں نے کہا "میں ایک انجینیر ہوں۔ مگر بزنس مینجمنٹ موجودہ زمانہ میں ایک مستقل سبجکٹ ہو چکا ہے۔ انجینیرنگ میں اپنی واقفیت کے باوجود مینجمنٹ کے معاملہ میں میں اپنے کو معذور پاتا ہوں۔ مجھے ایک ٹرینڈ منیجر کی تلاش ہے جو انتظامی معاملات میں میرا مددگار بن سکے۔"

اپنے دنیوی کاروبار میں لوگ اپنی محدودیت کو خوب جانتے ہیں۔ کوئی یہ غلطی نہیں کرتا کہ کام کے جس شعبہ سے وہ واقف نہیں ہے، اس میں کود پڑے اور بالآخر نقصان اٹھائے۔ مگر عجیب بات ہے کہ ملت کی رہنمائی کے میدان میں کوئی اس اصول کو ملحوظ رکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ ہر آدمی جو کچھ تقریر کرنا جانتا ہو، فوراً قیادت کے اسٹیج پر ظاہر ہو کر خدمت قوم کا کریڈٹ لینا شروع کر دیتا ہے۔ خواہ اس کی قیادت عملاً قوم کو بربادی کے گڑھے میں گرانے کے ہم معنی کیوں نہ بن جائے۔ حتیٰ کہ یہ نتائج اگر اس کی آنکھوں کے سامنے آجائیں تب بھی اس کے جوش قیادت میں کوئی کمی نہیں آتی۔ وہ نئے نئے الفاظ بول کر دوبارہ قوم کے کندھے پر سوار ہو جاتا ہے۔ موت کے سوا کوئی چیز نہیں جو اس کو اعتراف شکست پر مجبور کر سکے۔

دیکھئے کہ آپ کون سا درخت اگا رہے ہیں

دنیا کا نظام اللہ تعالیٰ نے محکم قوانین کے تحت بنایا ہے اور اس کا فیصلہ ہے کہ وہ ان قوانین میں کسی قسم کی تبدیلی قبول نہیں کرے گا۔ (فاطر ۴۳)

انھیں قوانین الٰہی میں سے ایک قانون یہ ہے کہ اس نے مقرر کر دیا ہے کہ جو لوگ سطحی نعروں اور جذباتی تقریروں پر اپنی قوم کو اٹھائیں گے، ان کی قومی زندگی برساتی جھاڑ جھنکاڑ کی طرح ہوگی۔ وقتی طور پر تو وہ بہت نمایاں دکھائی دیں گے۔ مگر ان کے اندر کوئی پائداری نہیں ہوگی۔ فاتحانہ نعروں پر اٹھنے والے لوگوں کے حصہ میں بالآخر صرف یہ فریاد آئے گی کہ "فلاں نے میرے درخت کو اکھاڑ دیا ہے"۔

اس کے برعکس جو لوگ گہری جڑوں اور دور رس منصوبوں پر اپنی قومی تعمیر کریں گے، ان کو مضبوط درختوں کی سی پائداری حاصل ہوگی، جس کو کوئی اکھاڑ نہیں سکتا اور جو صدیوں تک انسانیت کو اپنا سایہ اور پھل دیتے رہتے ہیں۔

(ابراہیم: ۲۷-۲۴)

اگر آپ دنیا میں کوئی حقیقی مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے حقیقی بنیادوں پر اپنی تعمیر کی منصوبہ بندی کیجئے۔ اس صحیح مقام کو دریافت کیجئے جہاں سے صحیح اور پائدار جدوجہد کا آغاز ہوتا ہے۔ اگر آپ نے اپنے آغاز کو پالیا تو آپ اپنے اختتام کو بھی پالیں گے، کیونکہ صحیح آغاز ہی کا دوسرا نام صحیح اختتام ہے۔

فضائی جاسوسی میں جو ہوائی جہاز استعمال ہوتے ہیں ان میں بہت نازک قسم کے کیمرے لگے رہتے ہیں۔ انتہائی بلندی پر اڑان کرنے کے باوجود ان کی تصویریں اتنی مکمل ہوتی ہیں کہ آدمی کے چہرے پر جذبات کا اتار چڑھاؤ تک دیکھا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ آواز سے تیز رفتار ہوائی جہاز عموماً دشمن کا نشانہ بننے سے بچ جاتے ہیں۔ اپنی آواز سے آگے پرواز کرنے کی وجہ سے ان کا پتہ زمین پر کھڑے ہوئے لوگوں کو اس وقت ملتا ہے جبکہ ہوائی جہاز ان کے اوپر سے گزر کر بہت دور پہنچ گیا ہو —— گویا زندگی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ آپ اپنا سفر اس طرح طے کریں کہ آپ کا حریف آپ کی کارگزاریوں سے صرف اس وقت واقف ہو جب کہ آپ اپنا کام پورا کر چکے ہوں۔

کبھی شکست بھی فتح ثابت ہوتی ہے

زندگی کے حقائق اس سے کہیں زیادہ وسیع ہیں کہ وہ فتح و شکست کی اصطلاحوں میں سما سکیں۔

اسلام کی قدیم تاریخ میں اغیار کی طرف سے اس کو دو بڑے فوجی مقابلے پیش آئے ہیں۔ ایک تاتاریوں سے، دوسرا مسیحیوں سے۔ تاتاریوں سے مقابلہ بارھویں صدی کے آخر میں پیش آیا۔ مسلم قوموں کو اس مقابلہ میں مکمل شکست ہوئی۔ مگر اس شکست کے اندر سے حیرت انگیز طور پر ایک نیا امکان برآمد ہوگیا۔ فتح نے تاتاریوں کے انتقامی جذبہ کو ختم کر دیا۔ اب وہ نفسیاتی طور پر اس پوزیشن میں تھے کہ مفتوح کے مذہب وعقائد پر بے آمیز رائے قائم کر سکیں۔ انھیں نظر آیا کہ اسلام ایک سچا دین ہے اور اس میں خود ان کی اپنی بھلائی چھپی ہوئی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی شکست پر ایک صدی بھی نہیں گزری تھی کہ تاتاری حکمراں مسلمان ہوگئے اور سارا مسئلہ ایک نئی بہتر شکل میں ختم ہوگیا ـــــــ فوجی میدان کے فاتح فطرت اور نفسیات کے میدان میں اپنے مفتوحوں سے شکست کھا گئے۔

مسیحی یورپ اور مسلمانوں کے درمیان مقابلہ اس کے برعکس مثال پیش کرتا ہے۔ مسیحی یورپ سے دو سو سالہ صلیبی لڑائی کے بعد مسلمانوں کو شاندار فتح حاصل ہوئی اور مسیحی اقوام کو بدترین شکست کے بعد واپس لوٹنا پڑا۔

مگر اس کے بعد کیا ہوا۔ سارے یورپ میں اپنے غالب حریف کے خلاف انتقام کی ایک نہ ختم ہونے والی آگ بھڑک اٹھی۔ اپنے تمام وسائل کو انھوں نے ایک نئے مقابلہ کی تیاری کے لئے استعمال کرنا شروع کیا۔ ان کی یہ مخالفانہ کوششیں پانچ صدیوں تک جاری رہیں۔ یہاں تک کہ ان کی کامیابی اس انتہا کو پہنچی کہ انھوں نے قوت و طاقت کے نئے میدان دریافت کر لئے۔ انھوں نے مسلمانوں کو زندگی کے ہر شعبے میں شکست دے کر ساری دنیا پر اپنی سیادت کا جھنڈا گاڑ دیا ـــــــ انھوں نے قدیم طرز کی ملاحی جہاز رانی کو ترقی دے کر دخانی جہاز رانی کے مقام پر پہنچایا اور اس کے زور پر تمام سمندروں پر قابض ہو گئے۔ انھوں نے دور مار ہتھیار تیار کر کے مسلم تلواروں کو کند کر دیا۔ انھوں نے مشینی صنعت ایجاد کر کے مسلم دستکاری کا خاتمہ کر دیا۔ انھوں نے سائنسی علوم وضع کر کے مسلمانوں کے روایتی علوم کو بے قیمت کر دیا۔ انھوں نے محکومی کی ایک نئی قسم (اقتصادی اور فنی محکومی) وجود میں لا کر تمام مسلم دنیا کو مجبور کیا کہ سیاسی طور پر آزاد ہونے کے بعد بھی وہ انھیں کی غلام اور محکوم بنی رہے۔

پچھلی آٹھ سو سالہ تاریخ کا یہ تجربہ بتاتا ہے کہ وہ لوگ سخت غلطی پر ہیں جو صرف فتح و شکست کی اصطلاحوں میں سوچتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے حقائق اس سے کہیں زیادہ وسیع ہیں کہ فتح و شکست کی اصطلاحوں میں سما سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ فتح کبھی شکست ثابت ہوتی ہے اور شکست بھی کسی وقت فتح بن جاتی ہے۔

اسلام کا طریقہ حقیقت پسندی کا طریقہ ہے
نہ کہ حالات کا اندازہ کئے بغیر چھلانگ لگانے کا

قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرٌ (حج ـ ۳۹)

ان لوگوں کو لڑنے کی اجازت دے دی گئی جن سے لڑائی کی جاتی ہے، اس لئے کہ ان پر ظلم ہوا اور بلاشبہ اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے۔

مکہ کے مشرک مسلمانوں کو بہت تکلیفیں دیتے تھے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تو کسی کا سر پھٹا ہوتا، کوئی زخمی ہوتا، کوئی چوٹ کھایا ہوا ہوتا۔ وہ آپؐ سے شکایتیں کرتے۔ مگر آپ کا جواب صرف یہ ہوتا: صبر کرو مجھے ابھی لڑنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے (اصبروا فانی لم اومر بالقتال، تفسیر النسفی)۔ اسی حال میں تیرہ برس گزر گئے۔ پھر ہجرت کے دوسرے سال مدینہ میں قتال کی ہدایات بھیجی گئیں۔ عبدالرزاق، عبد بن حمید، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، بزار، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابن حبان، حاکم، ابن مردویہ اور بیہقی نے دلائل میں عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ کچھ اوپر ستر آیات میں قتال کی ممانعت کے بعد اجازت کی یہ پہلی آیت قرآن میں نازل ہوئی (**ھی اول آیة اُذن فیھا بالقتال بعد ما نھی عنہ فی نیف وسبعین آیة**)

یہاں یہ سوال ہے کہ مسلمانوں پر ظلم تو مکی دور میں اپنی بدترین شکل میں ہو رہا تھا، اور اللہ بلاشبہ اس وقت بھی مسلمانوں کی نصرت پر پوری طرح قادر تھا۔ پھر مکہ میں "قتال" کی اجازت کیوں نہ دی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کے قانون کے مطابق مسلمان ابھی اتنے طاقتور نہ ہوئے تھے کہ ان کا کوئی اقدام فیصلہ کن نتیجہ تک پہنچ سکتا۔ ہجرت کے بعد جب مسلمانوں کی طاقت اس معیار کو پہنچ گئی کہ ان کا اقدام یوم الفرقان (انفال ـ ۴۱) کو وجود میں لانے کے ہم معنی بن سکے تو مڈبھیڑ کی اجازت دے دی گئی۔

پچھلے ڈیڑھ سو برس سے اسلام کے علم بردار جس طرح اپنے مفروضہ حریفوں سے ٹکرا رہے ہیں اور نقصان ہر بار اسلام کے علم برداروں کے حصہ میں آتا ہے، وہ اس قرآنی اصول کی صریح خلاف ورزی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام اقدامات محض نادانی کے اقدامات تھے، اگرچہ غلط طور پر ان کو "اسلامی جہاد" کا مقدس نام دے دیا گیا۔

مکمل تدبیر، اور اسی کے ساتھ اللہ پر مکمل اعتماد

انسان بیک وقت دو مختلف تقاضوں کے درمیان ہے۔ ایک عبدیت کا تقاضا، دوسرے امتحان کا۔ انسان کے حالت امتحان میں ہونے کا پہلو تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنے سارے اختیار اور اپنی تمام امکانیات کو بروئے کار لانے کی کوشش کرے۔ دوسری طرف عبدیت کا پہلو زور کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہر حال میں آدمی اللہ پر بھروسہ رکھے، اپنے کو یا اپنی تدبیروں کو کچھ نہ سمجھے۔ اسباب کا اہتمام ہمارے حالت امتحان میں ہونے کا اظہار ہے اور اللہ پر اعتماد ہماری حالت عبدیت کا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جب مکہ کے حالات اس حد تک سخت ہو گئے کہ لوگوں نے آپ کے قتل کا ارادہ کر لیا تو آپ اپنے وطن کو چھوڑ کر یثرب (مدینہ) چلے گئے۔ سیرت کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سفر کے لئے آپ نے ہر قسم کا ممکن اہتمام فرمایا —— سفر کے ہر جزء کو مکمل طور پر راز میں رکھا۔ عام شاہراہ کے بجائے غیر معروف راستہ سے سفر فرمایا۔ مکہ سے رات کے وقت پیدل نکلے اور سواری کا انتظام آگے ایک صحرائی مقام سے کیا۔ آپ کو مدینہ جانا تھا جو مکہ سے شمال کی جانب واقع ہے۔ مگر آپ نے اس کے الٹی طرف جنوبی سمت میں سفر فرمایا۔ مکہ کے باہر چند میل جا کر ایک سنسان پہاڑی غار (ثور) میں تین دن ٹھہرے رہے جو اتنا تنگ تھا کہ آدمی صرف لیٹ کر اس کے اندر داخل ہو سکتا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

آپ جب ابوبکر صدیق کے ساتھ غار ثور میں مقیم تھے، قریش کے کچھ لوگ آپ کو ڈھونڈتے ہوئے غار کے کنارے تک پہنچ گئے۔ آہٹ پا کر ابوبکر صدیق نے کہا، دشمن اتنے قریب آ چکا ہے کہ اگر انھوں نے جھک کر اپنے قدموں کے نیچے کی طرف دیکھا تو وہ ہم کو پالیں گے۔ آپ نے نہایت اطمینان کے ساتھ جواب دیا:

ماظنك باثنين يا ابابكر الله ثالثهما — ابوبکر! ان دو کی نسبت تمھارا کیا خیال ہے جن کا تیسرا اللہ ہو

اس واقعہ میں نبوت کا مقام نظر آرہا ہے۔ ایک طرف تدبیر کمال درجہ پر۔ دوسری طرف اللہ پر اعتماد کمال درجہ پر۔ یہی نبوت کی شان ہے۔ پیغمبر اس شان عبدیت میں کمال درجہ پر ہوتا ہے۔ پیغمبر کے ساتھیوں اور فیض پانے والوں میں بھی یہ اوصاف درجہ بدرجہ پیدا ہوتے ہیں۔

کیسی عجیب خیرامت

"مسلمان جب تک معاشی اور تعلیمی میدانوں میں برادران وطن کے برابر نہ ہوجائیں ان کو مظلوم اور محروم طبقہ قرار دے کر ان کو پس ماندہ فرقوں کی طرح مراعات اور سہولتیں دی جائیں" ——— یہ وہ مطالبہ ہے جو پچھلے چند سالوں سے تمام مسلم جماعتوں کی طرف سے حکومت سے کیا جارہا ہے۔ اس قسم کا مطالبہ کرنے والے لیڈر اگر فی الواقع اپنے مطالبہ میں سچے ہیں تو اس اصول کو سب سے پہلے انھیں خود اپنے درمیان جاری کرنا چاہئے۔ ہر لیڈر جو اس حال میں ہے کہ اس کے گرد و پیش (خاندان کے اندر یا باہر) کچھ لوگ اس کے مقابلہ میں معاشی حیثیت سے پچھڑے ہوئے ہیں، اس کو چاہئے کہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ اس وقت تک ان لوگوں کے لئے وقف رکھے جب تک یہ پس ماندہ لوگ معاشی حیثیت سے اس کے برابر نہ ہوجائیں۔ اس قسم کا مطالبہ کرنے والے قائدین اگر خود اپنے درمیان اس اصول کو جاری کرنے کے لئے تیار نہ ہوں تو وہ کیوں کر امید رکھتے ہیں کہ اپنی "حریف قوم" سے وہ اس کو منوانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔

عجیب بات ہے کہ اس قسم کا مطالبہ کرنے والے قائدین اسی کے ساتھ مسلمانوں کے "خیرامت" ہونے کا ذکر بھی زور شور کے ساتھ کرتے ہیں اور فخر کے ساتھ یہ اعلان کرتے ہیں کہ مسلمان کا منصب یہ ہے کہ وہ سارے عالم کے نظام کو درست کرے اور اس کو خیر و صلاح سے بھر دے۔ کیسی عجیب ہوگی وہ خیرامت جس کا حال ایک طرف یہ ہو کہ اپنے کو "مظلوم اور محروم" طبقہ قرار دے کر دنیا والوں سے رعایتوں کی خیرات مانگ رہی ہو۔ اور اسی کے ساتھ وہی وہ آسمانی گروہ ہو جس سے دنیا اپنی اصلاح و ترقی کی امید رکھے۔

ہماری ملی مشکلات کا سبب دراصل ہماری اپنی کوتاہیاں ہیں۔ ہم جدید اقتصادیات میں اپنی جڑیں قائم نہ کرسکے۔ ہم وقت کی تعلیم میں پیچھے ہوگئے۔ بے معنی اندرونی نزاعات نے ہم کو اتحاد سے محروم کر رکھا ہے۔ ہمارے سامنے کوئی ایسا قابل عمل مشن نہیں جس میں ہمارے افراد اپنی ذہنی اور عملی قوتوں کا نکاس پا سکیں۔ ہمارے قومی کردار کا حال یہ ہے کہ جب بھی کسی معاملہ میں ہمارے صبر، تحمل، محنت، دیانت داری، خیر خواہی، انصاف، بلند حوصلگی اور وسعت قلبی کا امتحان ہو تو اصاغر سے لے کر اکابر تک سب ناکام ثابت ہوتے ہیں۔ یہ داخلی کمزوریاں ہی ہمارا اصل مسئلہ ہیں اور ان کی اصلاح کے لئے خاموش جدوجہد کرنے کا نام کام ہے۔ مگر ہمارے کسی رہنما کو اس قسم کی تعمیری جدوجہد میں لگنے سے دلچسپی نہیں، البتہ طرح طرح کی بولیاں بول کر وہ لوگوں کے ذہنوں کو الجھائے ہوئے ہیں۔ کوئی یہ کہتا ہوا سنائی دیتا ہے کہ ہم کو حفاظت خود اختیاری کے تحت اپنا مسئلہ اپنے ہاتھ میں لینا چاہئے۔ کسی نے اسلام کے کچھ سیاسی قصائد یاد کر لئے ہیں اور وہ بس انھیں کو دہراتا رہتا ہے۔ کوئی جابجا تقریری نمائش گاہیں کھڑی کرنے میں جگمگاتا ہوا مستقبل دیکھ رہا ہے۔ کوئی شتر مرغ کی طرح خیالی پناہ گاہیں بنانے میں مصروف ہے۔ کوئی احتجاج اور مطالبات کی رٹ لگائے رکھنے کو کام سمجھتا ہے۔ مگر اس قسم کی ہر بات صرف اپنی بربادیوں کو دائمی بنانے کے ہم معنی ہے۔ یہ محض کچھ الفاظ ہیں اور جو مسئلہ عمل کی کمی سے پیدا ہوا ہو اس کو الفاظ بول کر حل نہیں کیا جاسکتا۔

ہر غروب کے لئے ایک نیا طلوع مقدر ہے

سورج پچھم میں غروب ہوتا ہے تاکہ دوبارہ پورب سے نئی شان کے ساتھ طلوع ہو۔ یہ ایک روشن نشانی ہے جو آسمان پر ظاہر ہو کر ہر روز ہمیں بتاتی ہے کہ خدا نے اپنی مملکت کا نظام کس طرح بنایا ہے۔ یہ اس حقیقت کا ایک کائناتی اعلان ہے کہ خدا کی اس دنیا میں کوئی "غروب" آخری نہیں۔ ہر غروب کے لئے ایک نیا طلوع مقدر ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ آدمی کے اندر حوصلہ ہو۔ غروب کا واقعہ پیش آنے کے بعد وہ از سرِ نو اپنی جدوجہد کا منصوبہ بنائے۔ زندگی کی شاہ راہ پر دوبارہ اپنا سفر شروع کر دے۔

ناکامی کے اسباب ہمیشہ آدمی کے اپنے اندر ہوتے ہیں
مگر اکثر وہ ان کو دوسروں کے اندر تلاش کرنے لگتا ہے

زندگی کا راز

ایڈجسٹمنٹ میں ہے

نہ کہ

مقابلہ آرائی میں

کہا جاتا ہے کہ جاپانی زبان میں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو "کام" کے مفہوم کو بتاتے ہیں۔ مگر ابھی حال تک جاپانی زبان میں ایسا کوئی لفظ نہ تھا جو "فرصت" کے مفہوم کو ادا کرتا ہو۔ غالباً یہ وہ عامل ہے جس نے جاپانی قوم کو دنیا میں سب سے زیادہ محنتی قوم بنا دیا ہے۔ دوسری عالمی جنگ میں جاپان کی اقتصادیات بالکل برباد ہوگئی تھیں۔ مگر جاپانی محنت نے معجزہ دکھایا۔ جنگ کے صرف ۲۵ سال بعد جاپان نے اقتصادی حیثیت سے دنیا کے چند انتہائی ترقی یافتہ ملکوں کی فہرست میں جگہ حاصل کرلی۔

مسلمانوں کا معاملہ ایک اور پہلو سے دلچسپ

Japanese did not have 'leisure'

There are plenty of words in the Japanese language meaning "work" but till recently it had no word for "leisure". This may be the one single factor to explain how Japan has emerged as a major economic power within the past two decades, says a report in The Times, London.

The Times of India, 9.11.1975

مثال پیش کرتا ہے۔ ہماری زبان میں اختلاف اور ٹکراؤ کے مفہوم کو بتانے کے لئے درجنوں الفاظ ہیں ــــ مگر ADJUSTMENT کے مفہوم کو صحیح طور پر ادا کرنے کے لئے کوئی لفظ نہیں۔

پچھلے دو سو برس سے ہندستانی مسلمانوں پر احتجاج اور ٹکراؤ کی سیاست اتنی زیادہ چھائی رہی ہے کہ اردو زبان میں اُس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے کوئی لفظ ہی نہ بن سکا جس کو انگریزی میں ADJUSTMENT کہا جاتا ہے۔ "بازمانہ ستیز" کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ہمارے یہاں درجنوں الفاظ ہیں۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ ADJUSTMENT کے مفہوم کو صحیح طور پر ادا کرنے کے لئے ہمارے یہاں کوئی ایک لفظ بھی نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان آج سب سے زیادہ لڑنے جھگڑنے والی قوم بن گئے ہیں۔ حالات سے ہم آہنگی کرتے ہوئے اپنا راستہ نکالنا جیسے ان کو آتا ہی نہیں۔ ان کی جنگ جویانہ تحریکوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا انھیں خبر ہی نہیں کہ زندگی کا راز ایڈجسٹمنٹ میں ہے نہ کہ مقابلہ آرائی میں۔

اس صورت حال کے نتیجہ میں ایک عجیب مشکل یہ پیدا ہوئی ہے کہ کوئی خدا کا بندہ اگر یہ کہتا ہے کہ ملی مقاصد کے حصول کے لئے جو منصوبہ بناؤ، حالات سے ہم آہنگ ہو کر بناؤ تو یہ بات ان کی سمجھ میں آتی ہی نہیں۔ اس قسم کی آواز حقیقتہً ایڈجسٹمنٹ کی آواز ہوتی ہے مگر سننے والے اس کو "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" کے ہم معنی سمجھ لیتے ہیں۔ کیوں کہ جن الفاظ سے وہ مانوس ہیں انھوں نے ان کو دو ہی مفہوم سے آشنا کیا ہے: زمانہ سے لڑنا یا ہوا کے رخ پر چلنا۔ ان دو کے علاوہ کسی تیسرے رخ کو وہ جانتے ہی نہیں۔

سب سے زیادہ معلوم بات جس کو لوگ سب سے زیادہ کم جانتے ہیں

ہر مسافر جانتا ہے کہ ایک ٹرین چھوٹ جائے تو جلد ہی بعد دوسری ٹرین مل جاتی ہے جس سے وہ اپنا سفر جاری رکھ سکے

یہ پلیٹ فارم کا سبق ہے ۔ مگر اکثر لوگ اس معلوم سبق کو اس وقت بھول جاتے ہیں جب کہ زندگی کی دوڑ میں ایک موقع ان کے ہاتھ سے نکل گیا ہو۔

اپنی غلطی کی قیمت آدمی کو خود ادا کرنی پڑتی ہے۔ مگر آدمی غلطی کرنے کے بعد ہمیشہ کسی دوسرے کو تلاش کرنے لگتا ہے جو اس کی طرف سے اس کی غلطی کی قیمت ادا کر دے ۔

جو شخص ہار کو مان لے وہی تیاری کرکے دوبارہ اپنے حریف کے مقابلہ میں کامیاب ہوتا ہے

۱۵ فروری ۱۹۷۸ کو ساری دنیا نے حیرت کے ساتھ یہ خبر سنی کہ باکسنگ کے مشہور چیمپین محمد علی کو ایک غیر معروف کھلاڑی لیون اسپنکس نے ہرا دیا۔ اب محمد علی کے لئے ایک راستہ وہ تھا جو عام طور پر ہارے ہوئے سیاستداں اختیار کرتے ہیں۔ وہ ایک اخبار نکال کر ججوں کی "دھاندلی" کا شور مچاتے۔ اپنے پرجوش حامیوں کو لے کر اسپنکس کے خلاف ایجی ٹیشن چلاتے اور اس کو قتل کرنے یا اس پر مقدمہ چلانے کی کوششیں کرتے۔ خود ساختہ طور پر ایک لقب وضع کرکے اپنے نام کے ساتھ لگا لیتے اور سمجھتے کہ وہ اب بھی کھیل کی دنیا کے "امام" ہیں۔ محمد علی اگر اس قسم کا راستہ اختیار کرتے تو اس کے لئے ان کے پاس پیسہ بھی تھا اور اعوان و انصار بھی۔ مگر اس قسم کے تمام طریقوں کو چھوڑ کر انھوں نے محنت و مشقت اور خاموش تیاری کا طریقہ اختیار کیا۔

ہارنے کے بعد پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت، محمد علی نے فروری ۱۹۷۸ کے تیسرے ہفتہ میں بنگلہ دیش کا پانچ روزہ دورہ کیا۔ ان کو بنگلہ دیش کی اعزازی شہریت دی گئی اور ان کو امریکہ میں بنگلہ دیش کا اعزازی قونصل جنرل بنانے کا اعلان کیا گیا۔ اس موقع پر ۲۲ فروری کو ڈھاکہ کی ایک پریس کانفرنس میں ایک اخباری نمائندہ نے محمد علی سے پوچھا کہ لیون اسپنکس سے مقابلہ میں ججوں کے فیصلہ کو کیا وہ صحیح فیصلہ سمجھتے ہیں۔ محمد علی نے صاف لفظوں میں کہا:

It was a fair decision.

یہ ایک بے لاگ فیصلہ تھا۔ علی نے صاف لفظوں میں اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہوئے کہا:

I misjudged the man (Spinks) and fought a wrong battle. my planning was not correct because I did not know much about Spinks

The Times of India, 23.2.1978

میں نے اپنے حریف کو سمجھنے میں غلطی کی اور اس سے غلط جنگ لڑی۔ میری منصوبہ بندی صحیح نہیں تھی کیوں کہ میں اسپنکس کے بارے میں کچھ زیادہ جانتا نہ تھا۔

محمد علی نے اب اپنی زندگی کا نیا نظام بنایا اور باقاعدہ تیاری میں لگ گئے۔ وہ دن بھر دوڑتے، پہاڑیوں پر چڑھتے۔ بھری ہوئی بوری میں گھونسے مار مار کر اپنے ہاتھوں کی تربیت کرتے۔ اپنے ساتھیوں سے آزمائشی مقابلے کرتے، اور اسی کے ساتھ عبادت کرکے دعا بھی کرتے کہ خدا انھیں اگلے مقابلہ میں کامیاب کرے۔

محمد علی کی عمر ۳۶ سال ہے اور ان کے حریف لیون اسپنکس کی عمر ۲۵ سال، یعنی دونوں کی عمر میں گیارہ سال کا فرق ہے۔ مبصرین کا خیال تھا کہ محمد علی کی عمر ان کے لئے فیصلہ کن ہو چکی ہے اور اب وہ اپنے نوجوان حریف سے دوبارہ جیت نہیں سکتے۔ مگر محمد علی نے پورے جوش اور اہتمام کے ساتھ اپنی تیاریاں جاری رکھیں۔ وہ روزانہ صبح ۵ بجے اٹھ کر تین میل پہاڑی راستہ پر دوڑتے جب کہ ابھی اندھیرا چھایا ہوا ہوتا اور لوگ اپنے نرم بستروں پر سوئے ہوئے ہوتے۔ اس کے بعد سارے دن سخت ترین

قسم کی ورزشوں میں لگے رہتے ۔

اگست میں، مقابلہ کی تاریخ سے کچھ پہلے، انھوں نے ڈیرلیک (پنسلوانیا) میں اپنے کھیل کا مظاہرہ کیا تھا اور اعلان کیا تھا کہ ۱۵ ستمبر کے مقابلہ میں میں دوبارہ ٹائٹل جیت لوں گا۔ اخباری رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ ۳۶ سالہ علی آج کل اپنے باکسنگ سنٹر پر زبردست تیاری میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ بے حد سنجیدہ ہو گئے ہیں ۔ اخباری رپورٹ کا ایک جملہ یہ تھا۔

Members of the Ali entourage insist that they have never seen Ali work so hard.
The Times of India 17.8.78

محمد علی کے ساتھیوں کا کہنا ہے کہ انھوں نے محمد علی کو اتنا سخت محنت کرتے ہوئے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔

اس طرح محنت اور تیاری کے چھ سخت مہینے گزارنے کے بعد محمد علی نے ۱۶ ستمبر ۷۸ ۱۹ کو دوبارہ لیون اسپنکس سے مقابلہ کیا اور اس کے اوپر شاندار فتح حاصل کی۔ اسپنکس فتح کے بعد عیاشیوں میں پڑ گیا حتیٰ کہ ٹریفک قواعد کی خلاف ورزی کرنے کے جرم میں پولس نے اس کا چالان کیا۔ جب کہ محمد علی برابر اپنی تیاریوں میں مشغول رہا۔

ہار کو مان لینا اعلیٰ ترین انسانی صفت ہے۔ یہ حقیقت واقعہ کا اعتراف ہے۔ یہ جھوٹ کو چھوڑ کر سچائی کا راستہ اختیار کرنا ہے۔ جو شخص اپنی ہار مان لیتا ہے، اس کے اندر حقیقت پسندانہ نفسیات ابھرتی ہیں۔ وہ سنجیدگی کے ساتھ حالات کا جائزہ لینے لگتا ہے۔ وہ اپنی کمزوریوں کو سمجھ کر دوبارہ اپنی منصوبہ بندی کرتا ہے۔ وہ حریف کے خلاف لفظی طوفان اٹھانے کے بجائے حقیقی میدان میں اس کا مقابلہ کرنے کی تیاریاں کرتا ہے۔ ایک طرف اس کا حریف فتح کی خوشی میں مگن ہوتا ہے۔ دوسری طرف یہ اپنی شکست کے احساس کو لئے ہوئے سنجیدہ تیاریوں میں مصروف ہوتا ہے ـــــ ان باتوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو شخص مقابلہ کے میدان میں ہار گیا تھا وہ دوبارہ اپنے حریف کو شکست دے کر کامیاب ہو جاتا ہے۔

مکان نیچے سے اٹھایا جاتا ہے نہ کہ اوپر سے

زمین کو انسان کی قیام گاہ بنایا گیا ہے۔ مگر وہی قیام گاہ زمین کے اوپر کھڑی ہوتی ہے جس کی تعمیر کو بنیاد سے شروع کر کے چھت تک پہنچایا گیا ہو۔ کوئی شخص چھت کی طرف سے اپنا مکان بنانا شروع کر دے تو خدا کی زمین ایسے مکان کو قبول کرنے سے انکار کر دے گی۔

یہ اس دنیا کی ایک اٹل حقیقت ہے۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ جب ملت کی تعمیر کا سوال آتا ہے تو لوگ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں۔ وہ چھت کی طرف سے ملت کا محل اٹھانا شروع کر دیتے ہیں۔ خواہ ان کا محل بالآخر زمین بوس ہو کر مایوسی اور بے یقینی کے ملبہ کے سوا ان کے لیے کچھ اور نہ چھوڑے۔

ناموافق حالات زندہ قوموں کیلئے
ترقی کا زینہ بن جاتے ہیں

آرنلڈ ٹائن بی (۱۹۷۵-۱۸۸۹) چند خوش قسمت مصنفین میں سے ہے جس نے اپنی زندگی ہی میں عالمی مقام حاصل کرلیا۔ اس انگریز مورخ کو سب سے زیادہ شہرت اپنی ۱۰ جلدوں پر مشتمل "اسٹڈی آف ہسٹری" کی وجہ سے ملی جس میں اس نے ۲۱ تہذیبوں کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کتاب کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ وہ قوتیں جو تاریخ بناتی ہیں، وہ بنیادی طور پر داخلی قوتیں ہیں نہ کہ خارجی اسباب۔ اس نے قدیم زمانہ سے لے کر اب تک تمام بڑی تہذیبوں کا مطالعہ کرکے دکھایا ہے کہ ان تہذیبوں کو جن قوموں نے پیدا کیا، وہ تخلیقی صلاحیت رکھنے والی اقلیتیں تھیں جنھوں نے وقت کے چیلنج کا کامیابی کے ساتھ جواب دیا۔

اقلیتوں کے ساتھ ہمیشہ یہ ہوا ہے کہ وہ اکثریت کی طرف سے مسلسل دباؤ میں رہتی ہیں۔ یہ دباؤ عملی زندگی میں بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کی وجہ سے کسی قوم کی وہ اندرونی تخلیقی صلاحیت ابھرتی ہے جو اُس کو اِس قابل بناتی ہے کہ وہ پیش آنے والے چیلنج کے مقابلہ میں قائدانہ رول ادا کرسکے۔ اس کے برعکس جن قوموں کی لغت میں "دباؤ" کے معنی صرف "مظلومیت" کے ہوتے ہیں، ان کے حصہ میں فریاد واحتجاج کے سوا کچھ نہیں آتا۔ وہ اپنی محرومیوں کا رجسٹر بنانے میں مشغول رہتی ہیں یا جلسوں اور تقریروں کا کمال دکھا کر سمجھتی ہیں کہ انھوں نے اپنی سربلندی کا راز پالیا ہے۔ یہاں تک کہ جب وقت کا قافلہ آگے بڑھ جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لئے اس دنیا میں قبرستان کے سوا اور کچھ نہیں۔

جھگڑے سے ہٹ کر اپنی تعمیر کیجئے

بے وقوف کسان نے مینڈ کے جھگڑے کو مینڈ پر طے کرنے کی کوشش کی۔ جس کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ بے شمار نئے نئے جھگڑے کھڑے ہو گئے۔ اور پہلا جھگڑا ابھی طے نہ ہوا۔

عقلمند کسان کو اپنے پڑوسی سے مینڈ کا جھگڑا پیش آیا تو اس نے مینڈ کو چھوڑ دیا۔ وہ اس کوشش میں لگ گیا کہ اپنے بقیہ کھیتوں اور باغوں کو ترقی دے۔ اس طریق کار کا شاندار نتیجہ برآمد ہوا۔ بالآخر اس نے نہ صرف اپنی کھوئی ہوئی مینڈ حاصل کر لی بلکہ اس قابل ہو گیا کہ پہلے سے بھی زیادہ بڑی جائداد اپنے لئے خرید لے۔

□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□

ناکافی تیاری کے ساتھ کیا ہوا اقدام ——— مسئلہ کو پہلے سے زیادہ سنگین بنا دیتا ہے

شیر اپنی فطرت کے اعتبار سے انسان خور نہیں ہوتا۔ کسی شیر کو انسان خور بنانے والے اکثر وہ غیر ماہر شکاری ہوتے ہیں جو شیر پر گولی چلاتے ہیں مگر ان کی گولی صحیح نشانہ پر پڑنے کے بجائے اچٹتی ہوئی نکل جاتی ہے۔ اس قسم کا شیر انسان دشمن ہو جاتا ہے۔ وہ جہاں کہیں انسانی شکل کو دیکھتا ہے، اس پر حملہ کر کے اسے کھا جاتا ہے ——— اسی طرح اگر آپ اپنے حریف پر ایسے اقدامات کریں جو ناکافی تیاری کی وجہ سے فیصلہ کن نہ بن سکیں تو اس قسم کا ہر اقدام آپ کے حریف کو پہلے سے زیادہ مشتعل کر کے آپ کے مسئلہ کو اور زیادہ سنگین بنا دے گا۔

لڑائی بھڑائی کا نام سیاست نہیں

ابوفراس حمدانی عباسی دور کا شاعر ہے۔ وہ اپنے ایک قصیدہ میں کہتا ہے:

إذا ما أرسل الأمراء جيشاً
إلى الأعداء أرسلنا الكتابا

یعنی ہماری دھاک کا یہ عالم ہے کہ جہاں دوسرے امراء کو مقابلہ کرنے کے لئے لشکر بھیجنا پڑتا ہے وہاں ہم صرف خط بھیج دیتے ہیں اور وہی فیصلہ کرنے کے لئے کافی ہو جاتا ہے ——

شاعر نے ایک شعر میں سیاست کا راز بتا دیا ہے۔ سیاست یہ نہیں ہے کہ حریف سے براہ راست لڑائی چھیڑ دی جائے۔ سیاست یہ ہے کہ اپنے آپ کو اتنا طاقت ور اور مستحکم بنایا جائے کہ جب ضرورت پڑے تو ایک تحریری وارننگ بھیج دینا معاملہ کو ختم کرنے کے لئے کافی ہو۔

آپ لکڑی کو توڑیں تو وہ دو ٹکڑے ہو جائے گی مگر زندہ چیزوں کے لئے شکست کا کوئی سوال نہیں۔ ایک زندہ ایبا (AMOEBA) جب ٹوٹتا ہے تو وہ دو زندہ ایبا بن جاتا ہے۔

کام صرف وہ ہے جو خود اپنے مثبت فکر کے زور پر وجود میں آئے۔ خارجی حالات کے خلاف ردعمل کے طور پر جو چیز ظاہر ہو، وہ کام نہیں، جذباتی ابال ہے۔ اس قسم کا جذباتی ابال وقتی شور و شر تو ضرور پیدا کر سکتا ہے۔ مگر اس سے کسی حقیقی نتیجہ کی امید کرنا ایسا ہی ہے جیسے کتے کی بھونک سے بلبل کے نغمہ کی توقع کی جائے۔

نادانی کی چھلانگ

حکایت ہے کہ کسی زمانہ میں بہت بڑا سیلاب آیا۔ ایک بندر اور ایک مچھلی اس میں پھنس گئے۔ بندر تیز تھا۔ چھلانگ لگا کر ایک درخت پر چڑھ گیا اور ایک شاخ پر جا بیٹھا جہاں وہ سیلاب کی طوفانی موجوں سے محفوظ تھا۔ اب اس نے نیچے نظر ڈالی تو دیکھا کہ مچھلی امنڈتی ہوئی لہروں کے خلاف جدوجہد میں مصروف ہے۔ اس نے سمجھا کہ مچھلی طوفان میں پھنس گئی ہے۔ وہ پوری ہمدردی اور نیک نیتی کے ساتھ نیچے آیا اور مچھلی کو پانی سے نکال کر خشکی پر ڈال دیا۔ اس کے بعد جو نتیجہ نکلا وہ ظاہر ہے۔

نادان دوستی کی یہ تمثیل اڈیسن کی زندگی میں واقعہ بن چکی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اڈیسن ایک کتا پالے ہوئے تھا جو اس کو بہت محبوب تھا۔ ایک روز اڈیسن کا کتا اس کے مطالعہ کے کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ میز پر اس کے ضروری کاغذات پھیلے ہوئے تھے اور کرسین کا لیمپ جل رہا تھا۔ ایک پتنگا کہیں سے کمرے میں داخل ہو گیا اور لیمپ کے گرد منڈلانے لگا۔ کتا دیر تک یہ منظر دیکھتا رہا۔ آخر اس کو گوارا نہ ہوا کہ اس کے آقا کی میز پر ایک پتنگا قابض ہو جائے۔ اس نے اس کو پکڑنے کے لئے ایک چھلانگ لگائی۔ پتنگا تو اڑ گیا، البتہ لیمپ الٹ گیا اور میز پر تیل پھیل جانے کی وجہ سے فوراً آگ لگ گئی اور کاغذات جل گئے۔ اڈیسن نے دیکھا تو کہا:

"میرے محبوب کتے! تجھے نہیں معلوم کہ تو نے کیا کیا۔"

موجودہ زمانے میں ہمارے رہنماؤں نے بھی حیرت انگیز طور پر اسی قسم کے کارنامے دکھائے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اصلاح ملت اور احیائے اسلام کا نعرہ لے کر اٹھا۔ مگر ہر ایک نے ایسی نادانی کی چھلانگیں لگائیں کہ اصل مقصد تو حاصل نہیں ہوا البتہ نئے نئے مسائل اور نئی نئی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں جس کے نتیجہ میں مسئلہ پہلے سے بھی زیادہ گمبھیر ہو گیا۔ نادانی کے اقدام سے کہیں زیادہ بہتر یہ ہے کہ کوئی اقدام ہی نہ کیا جائے۔

حقیقت پسند بنئے

خدا نے اپنی دنیا کا نظام انتہائی محکم بنیادوں پر بنایا ہے۔ کوئی درخت کبھی طلسماتی طور پر نہیں اگتا۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ایک آسمانی کرہ چھلانگ لگا کر اچانک اس سرے سے اس سرے پر پہنچ جائے۔

ایک ایسی دنیا میں ہم ایسے "بزرگ" کی پیدائش کا انتظار کر رہے ہیں جو کراماتی طور پر واقعات کو ظہور میں لائے۔ ہم ایسے "قائد" کی تلاش میں ہیں جو ایک بڑا سا مظاہرہ کر کے آناً فاناً قوم کے لئے نیا مستقبل پیدا کر دے۔

جو لوگ اس قسم کی امیدوں پر جی رہے ہیں انھیں جاننا چاہئے کہ خدا کی اس دنیا میں ایسے طلسماتی واقعات کا ظہور ممکن نہیں۔ اگر انھیں طلسمات ہی کے سہارے زندہ رہنا ہے تو ان کو اپنی پسند کے مطابق دوسری کائنات بنانی پڑے گی

"سا دھارن لُوگوں سے اسا دھارن منش بنتے ہیں" یہ ہندی کی ایک سوکتی ہے عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بڑا انسان بننے کے لئے کوئی بڑا واقعہ چاہئے جو اس کو اخبار کی شاہ سرخی میں جگہ دے سکے۔ مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اکثر معمولی باتوں میں غیر معمولی انسان بننے کا راز چھپا ہوتا ہے۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس راز کو جانتے ہوں

لفظی تسکین کی قیمت
بہت مہنگی دینی پڑی

جنگ عظیم ثانی میں آخری شکست سے کچھ ماہ پہلے جاپانی لیڈر یہ سمجھ چکے تھے کہ وہ بازی ہار چکے ہیں۔ اتحادی طاقتوں کی طرف سے ۲۶ جولائی ۱۹۴۵ کو پوٹسڈم ڈیکلیریشن جاری کیا گیا تو وہ ذہنی طور پر ہتھیار ڈالنے کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ جاپانی پارلیمنٹ کی خواہش تھی کہ اس ڈکلریشن کی بنیاد پر اتحادی طاقتوں سے امن کی گفتگو شروع کی جائے۔

باضابطہ فیصلہ سے پہلے ۲۸ جولائی کو جاپانی وزیر اعظم سوزوکی (SUZUKI) نے ایک پریس کانفرنس کی۔ انھوں نے پریس کے نمائندوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ جاپانی کابینہ موکوستسو (MOKUSATSU) کی پالیسی پر عمل کر رہی ہے۔ موکوستسو ایک جاپانی لفظ ہے جس کا کوئی قطعی متبادل انگریزی زبان میں نہیں ہے۔ حتیٰ کہ خود جاپانی میں بھی وہ ایک غیر واضح لفظ ہے۔ اس کا ایک مفہوم "تبصرہ سے رکنا" ہے۔ اور اغلباً جاپانی وزیر اعظم کی مراد یہی تھی۔ مگر خود جاپانی زبان ہی میں اس لفظ کا ایک اور مفہوم بھی ہے، اور وہ ہے نظر انداز کرنا۔

جاپانی وزیر اعظم کو کابینہ کی طرف سے جس بیان کی ہدایت کی گئی تھی، وہ یہ تھا کہ جاپانی کابینہ پوٹسڈم ڈکلریشن کے معاملہ میں ابھی کسی فیصلہ پر نہیں پہنچی ہے۔ مگر انھوں نے پریس کانفرنس میں جو لفظ استعمال کیا وہ سننے والے اخبار نویسوں کے لئے مبہم ثابت ہوا۔ جاپان کی ڈومی نیوز ایجنسی نے وزیر اعظم کے بیان کا جو انگریزی ترجمہ نشر کیا اس میں موکوستسو کا ترجمہ IGNORE کے لفظ سے کیا گیا۔ ایک لفظ کے دو ممکن مفہوم میں سے سخت تر مفہوم کے انتخاب کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ ۱۹۴۴-۴۵ کے جاپان میں جنگی جنون کا جو ماحول تھا، اس میں "نظر اندازی" کا تصور عوامی ذوق کے زیادہ مطابق تھا۔ جاپان کے قومی حوصلوں کے لئے اس میں زیادہ تسکین مل رہی تھی۔ مگر اس لفظی تسکین کی قیمت جاپان کو بہت مہنگی ادا کرنی پڑی۔

اتحادی طاقتوں کے دفاتر میں جب یہ نشریہ سنا گیا تو انھوں نے سمجھا کہ جاپانیوں نے پوٹسڈم ڈکلریشن کو نظر انداز کر دیا ہے ـــــ چند دن بعد ہی جاپان پر دو ایٹم بم گرائے گئے اور ہیروشیما اور ناگاساکی تباہ ہو گیا۔ دو لاکھ انسان فوراً مر گئے اور بے شمار لوگ خطرناک طور پر زخمی ہوئے۔

یہ انکشاف کاسو کوائی (KASUO KAWAI) نے کیا ہے جو اس سے پہلے جاپان کے طاقتور اخبار نپن ٹائمس (NIPPON TIMES) کے ایڈیٹر تھے۔

بلین ٹروتھ، دسمبر ۱۹۷۰

یہ کوئی ایک واقعہ نہیں جو صرف جاپان کے ساتھ پیش آیا ہو۔ افراد یا قوموں کے ساتھ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی معاملہ کو ساکھ کا معاملہ بنا لیتے ہیں وہ حقیقت پسندی کی زبان بولنے پر تیار نہیں ہوتے۔ وہ کمزور حالت میں ہونے کے باوجود ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جس میں ان کی بڑائی باقی رہے۔ اس سے وقتی طور پر لفظی تسکین ضرور ہوتی ہے۔ مگر بالآخر اس کی بہت مہنگی قیمت دینی پڑتی ہے۔ کیوں کہ حقائق کا طوفان ان کے الفاظ کو اسی طرح بہالے جاتا ہے جس طرح آندھی خس و خاشاک کو۔

چلنا وہی ہے جو صحیح سمت میں ہو

کوئی شکاری اگر جانور کے سایہ کو جانور سمجھ کر بندوق چلا دے تو اس کی گولی اپنا نشانہ کھو دے گی، کارتوس خالی کرنے کے بعد بھی وہ اپنی مطلوبہ چیز سے محروم رہے گا۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو زندگی کا نصب العین مقرر کرنے میں غلطی کر جائیں۔ اگر آپ نے نصب العین کا تعین صحیح نہیں کیا ہے تو آپ کی ساری کوششیں اور قربانیاں اسی طرح رائگاں چلی جائیں گی جس طرح کوئی شکاری غلط نشانہ پر بندوق چلا دے اور بالآخر اس کے حصہ میں خالی کارتوس کے سوا اور کچھ نہ ہو۔

اس میں نصیحت ہے

انگلستان میں یہ قانون ہے کہ جانور کو ذبح نہ کیا جائے بلکہ کرنٹ کے ذریعہ ہلاک کیا جائے۔ اور اگر ذبح کیا جائے تو پہلے جانور کو بیہوش کر لیا جائے۔ مگر دونوں صورتوں میں ذبح کے اسلامی حکم پر عمل نہیں ہوتا۔ تاہم پچھلے دس سال سے برطانیہ میں مقیم مسلمانوں کو ذبیحہ کی اجازت مل گئی ہے، برمنگھم میں ۱۹۶۰ سے ایک حلال میٹ کمپنی قائم ہے۔ اس کا کام اب اتنا بڑھ چکا ہے کہ اس وقت روزانہ تین ہزار سے چار ہزار تک جانور اور ۱۸ ہزار مرغیاں ذبح کی جاتی ہیں۔ اس کا اسٹاف ۵۰ لوگوں پر مشتمل ہے۔

برطانیہ میں مسلمانوں کو یہ سہولت کیونکر حاصل ہوئی، برطانیہ کے ایک مسلمان اقبال مسعود ندوی لکھتے ہیں:

"یہاں ایک اور فرقہ ہے جو اپنے طریقہ کے مطابق جانور ذبح کرتا ہے۔ یہ یہود کا فرقہ ہے۔ حکومت ان سے تعرض نہیں کرتی۔ ایک وجہ ان کی اقتصادی سیاسی اہمیت ہے۔ ان کا معیار بھی خاصا اونچا ہے۔ بلکہ دراصل اس فرقہ کے ساتھ رعایت ہی کی وجہ سے یہاں پر ذبیحہ کی اجازت مل سکی ہے۔"

الحسنات رام پور فروری ۱۹۷۸ صفحہ ۲۷

یہ واقعہ اس بات کی مثال ہے کہ اغیار کے پیدا کردہ حالات کس طرح کبھی اسلام کے لئے مفید بن جاتے ہیں۔ اسی طرح کبھی اس کے برعکس صورت حال بھی پیش آتی ہے۔ یعنی مسلمان اپنی نادانی سے ایسے حالات پیدا کرتے ہیں کہ اسلام کے لئے موافق حالات برباد ہو جائیں۔ ایک ایسی جد وجہد جو اسلام کے نام پر کی گئی ہو، بالآخر وہ غیر اسلامی نتیجہ پر ختم ہو۔

یہ لکڑی کی ہنڈیا میں سالن پکانا ہے

کوئی شخص یہ نادانی نہیں کرے گا کہ اپنے گھر کا کھانا کاٹھ کی ہنڈیا میں پکائے۔ کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ چولھے کی آگ کاٹھ کی ہنڈیا کو جلا دے گی۔ اور بالآخر آدمی کے حصے میں کچھ نہیں آئے گا۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ ملت کا کھانا ہر آدمی کاٹھ کی ہنڈیا میں پکا رہا ہے۔ نعرے اور پوسٹر، جلسے اور کانفرنسیں، شاعری اور خطابت، احتجاج اور مطالبات، یہ سب "کاٹھ کی ہنڈیا" ہیں۔ مگر ہمارے تمام قائدین انھیں کے ذریعہ ملت کا مستقبل تعمیر کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ پچھلی کئی نسلوں کے ناکام تجربات بھی ان کے جوش میں کمی کا باعث نہ ہو سکے۔

چیخنا کام نہ آیا

جہاز چٹان سے ٹکرا کر چور چور ہو چکا تھا۔
اس کے ٹوٹے ہوئے تختے سمندر کی موجوں میں ہچکولے کھا رہے تھے
سینکڑوں مسافر اپنی منزل کے بجائے سمندر کی تہ میں پہنچ چکے تھے۔
اور جہاز کا کپتان ایک تختہ کا سہارا لیے ہوئے چیخ رہا تھا ——

کتنی بے رحم ہے وہ قدرت جس نے سمندر میں چٹان ابھار دی
کیسی ظالم ہے وہ حکومت جس نے یہاں روشنی کا مینار تعمیر نہیں کیا
کتنے مجرم ہیں وہ جہاز ساز جنھوں نے جہاز کو حادثہ پروف نہیں بنایا

وہ چیخ رہا تھا، اور چیخ رہا تھا
مگر وہاں کوئی سننے والا نہ تھا جو اس کی چیخ کو سنے
اس کی آواز فضا میں تحلیل ہوتی رہی
یہاں تک کہ وہ بھی اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ سمندر میں غرق ہو گیا
اس کا چیخنا اس کے کام نہ آیا اور نہ دوسروں کے۔

عقل سے کام لیجئے نہ کہ جذبات سے

کسی شخص یا گروہ کی کامیابی کا راز کیا ہے۔ ایک لفظ میں یہ کہ: وہ انتہائی جذباتی مواقع پر انتہائی عقلی فیصلے کر سکے۔ اسی کو صبر کہتے ہیں۔ زندگی ایک مسلسل امتحان ہے جس میں بار بار ایسے مواقع آتے ہیں کہ آدمی جذبات سے مغلوب ہو جائے، وہ متاثر ذہن کے تحت کارروائی کرنے لگے۔ ایسے مواقع پر اپنے عقل و ہوش کو باقی رکھنا اور واقعات سے الگ ہو کر واقعات کے بارے میں فیصلہ کرنا قرآن کی اصطلاح میں صبر ہے اور یہی کسی کی کامیابی کی واحد یقینی ضمانت ہے۔ ولکم النصر ما صبرتم

وہ انھیں کھلاڑیوں کی بی ٹیم ہوگی

Second Eleven

Mr T. A. Pai, ex-Cabinet Minister, when asked to comment on the "no-change" in the style of functioning and the poor performance of the Government, is said to have remarked: "Why should anyone have expected anything better from them? They are only our B team."

The Illustrated Weekly of India
May 14, 1978

مسٹر ٹی۔ اے۔ پائی اندرا حکومت میں وزیر کابینہ تھے۔ ان سے موجودہ جنتا حکومت کے بارے میں پوچھا گیا کہ سرکاری مشین کی سست رفتاری اور اس کا طریقہ جو پہلے تھا وہی اب بھی کیوں ہے۔ حکمراں پارٹی کی تبدیلی کے باوجود اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ مسٹر پائی نے جواب دیا "لوگوں نے موجودہ حکومت سے کسی بہتر چیز کی توقع کیوں کر لی تھی۔ وہ آخر ہماری ہی "بی ٹیم" تو ہیں۔

اس میں ان مسلمانوں کے لئے بھی سبق ہے جو ایک ملکی پارٹی کو ہٹا کر دوسری ملکی پارٹی کو برسر اقتدار لانے میں ملت کے مستقبل کا سیاسی خواب دیکھا کرتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ ایک کو ہٹا کر جس دوسرے کو وہ اوپر لائیں گے، وہ بھی پچھلے کھلاڑیوں ہی کی "بی ٹیم" ہوگی۔

کبھی سیاست کو ترک کرنے ہی
کا نام سیاست ہوتا ہے

اکتوبر ۱۹۴۴ میں دوسری عالمی جنگ اپنے شباب پر تھی۔ امریکہ، بحرالکاہل کے جزائر کو فتح کرتے ہوئے، جاپان کے دروازہ تک پہنچ چکا تھا۔ اس وقت جاپان کے وائس ایڈمرل اونیشی (TAKIJIORO ONISHI) نے اپنی فوج کے اعلیٰ افسروں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا:

"میرے خیال سے اب ایک ہی راستہ رہ گیا ہے جس میں ہم یقین کر سکیں کہ ہماری معمولی طاقت زیادہ سے زیادہ موثر بن سکتی ہے۔ وہ یہ کہ ہم "زیرو فائٹرس" کا ایک دستہ بنائیں جو ۲۵۰ کیلوگرام کا بم لے کر دشمن کے سمندری جنگی جہازوں پر اپنے آپ کو گرادیں"

اونیشی کی یہ تجویز ہوابازوں تک پہنچائی گئی۔ فی الفور منظوری کا فیصلہ ہو گیا۔ ہوابازوں کا ایک دستہ بنایا گیا جس کا نام تھا کامی کیز (KAMIKAZE) یہ ایک جاپانی لفظ ہے جس کے معنی ہیں "خدائی آندھی"۔ یہ نام اس لئے اختیار کیا گیا کیونکہ تیرھویں صدی میں قبلائی خاں کے حملہ سے "ایک خدائی آندھی نے جاپان کو بچایا تھا" جس میں اس کی جنگی کشتیاں ایک سمندری طوفان نے تباہ کر ڈالی تھیں۔

اگست ۱۹۴۵ میں جنگ ختم ہوئی تو پانچ ہزار کی تعداد میں جاپانی ہواباز اس طرح اپنی جانیں دے چکے تھے۔ انھوں نے اکتوبر ۱۹۴۴ اور جون ۱۹۴۵ کے درمیان ۳۴ امریکی جنگی جہازوں کو تباہ کر دیا تھا۔

جاپان کے بہادر ہوابازوں نے کن جذبات کے ساتھ یہ قربانیاں دی تھیں، اس کا اندازہ ایک خط سے ہوگا۔ سسومو (SUSUMU KIJITSU) اسی قسم کا ایک ۲۲ سالہ جاپانی ہواباز تھا جس نے ایک بم لے کر اپنے ہوائی جہاز کو دشمن کے ایک سمندری جنگی جہاز پر گرایا تھا، اس نے آخری دن اپنے دفتر سے اپنے خاندان کو حسب ذیل خط لکھا:

"میرے پیارے والدین، پیارے بھائیو اور میری پیاری بہن!

یقیناً آپ کو اس کا علم نہیں ہوگا، مگر چند دن پہلے میں نے آپ کو الوداع کہی ہے جب کہ میں اپنے گھر کے اوپر پرواز کر رہا تھا، میرے جہاز کے بازوؤں کے سایہ نے ہمارے مکان کی چھت کو چھوا۔ میرے خیالات ہمہ تن آپ کی طرف لگے ہوئے تھے۔ میں جانتا ہوں کہ بہت جلد میرا وقت آجائے گا۔ مگر مجھے موت کا ڈر نہیں۔ مجھے صرف یہ فکر ہے کہ میرا عمل کیا جاپان کو بچانے کے لئے مفید اور فیصلہ کن ثابت ہوگا۔ میں اور میرے ساتھی یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہماری قربانیاں ہمارے بعد کی نسلوں کے لئے فتح لے آئیں گی۔ ہم نہایت پرسکون ہیں۔ ہم اکثر مذاق کرتے ہیں اور اپنا وقت پڑھنے اور تاش کھیلنے میں گزارتے ہیں۔ آپ ہمارے لئے غمگین نہ ہوں۔ اس کے برعکس آپ کو فخر کرنا چاہئے کہ میرا جسم اگرچہ جلد ہی ختم ہو جائے گا مگر میری روح ہمیشہ آپ کے پاس رہے گی ـ ـ ـ ـ اب الوداع، کیونکہ آخر وقت کی گھنٹی ہو چکی ہے۔

(آپ کا بیٹا اور بھائی سسومو)

تاہم تاریخ کی یہ انوکھی قربانی جاپان کو بچانے والی ثابت نہ ہو سکی۔ کیوں کہ دشمن کے پاس ایک اور برتر طاقت تھی جس کے مقابلہ میں جاپانی ہوابازوں کی یہ لامثال قربانی

Kamikaze: Suicide Pilots

بھی بے اثر تھی۔ یہ تھا ایٹم بم۔ ۶ اگست ۱۹۴۵ کو امریکی ہوائیہ نے دو ایٹم بم جاپان کی زمین پر گرائے جس نے ہیروشیما اور ناگاساکی جیسے عظیم صنعتی شہروں کو چند منٹ میں خاک کا ڈھیر بنا دیا۔ اب جاپان کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ امریکہ کے سامنے ہتھیار ڈال دے۔ تاہم جاپان کے لئے اب بھی راستے بند نہیں ہوئے۔ اب اس نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ اس نے "جنگ کو جاری رکھنے کے لئے جنگ کے خاتمہ" کا اعلان کر دیا۔ جاپان کے شہنشاہ ہیرو ہیٹو نے ریڈیو پر قوم کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

"— ہم ایک ناقابل برداشت صورت حال سے دوچار ہیں۔ مگر ہمیں اس ناقابل برداشت کو برداشت کرنا ہے تاکہ ہم جاپان کی اگلی نسلوں کی تعمیر نو کر سکیں۔"

جاپان نے امریکہ کے سیاسی اور فوجی اقتدار کو تسلیم کر لیا اور اس کے تحت غیر سیاسی میدانوں میں اپنی ترقی و استحکام کی تدبیریں شروع کر دیں۔ اب ان کا خصوصی نشانہ تھا سائنسی تعلیم اور جدید صنعت — "جنگ کو ختم کر کے جنگ جاری رکھنے" کی تدبیر کامیاب رہی۔ ۱۹۴۵ میں کئے گئے اس خاموش فیصلہ کا نتیجہ ۱۹۷۰ میں برآمد ہوا۔ ۲۵ سال تک "سیاست" چھوڑنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان ایک ناقابل تسخیر سیاسی طاقت بن گیا۔ سائنسی تعلیم، ٹکنالوجی، صنعت اور قومی کردار کی تعمیر میں جاپان نے جو غیر معمولی کامیابیاں حاصل کی تھیں، اس نے اپنے بالواسطہ اثرات پیدا کرنے شروع کئے۔ یہاں تک کہ امریکہ کے لئے اس کو نظر انداز کرنا ناممکن ہو گیا۔ امریکہ نے جزائر جاپان کا اقتدار جاپانی باشندوں کے حوالے کر دیا۔ اس کی فوجیں اوکی ناوا میں اپنے عظیم فوجی اڈہ کو خالی کر کے اپنے وطن واپس چلی گئیں۔

وہ ہار کو ماننا جانتا تھا

امریکہ کے ایک شخص نے ۱۸۳۱ میں تجارت کی۔ اس میں وہ ناکام ہو گیا۔ ۱۸۳۲ میں اس نے الکشن میں شکست کھائی۔ ۱۸۳۴ میں اس نے دوبارہ تجارت کی مگر اس بار بھی ناکام رہا۔ ۱۸۴۳ میں اس کو امید تھی کہ اس کی پارٹی اس کو کانگرس کی ممبری کے لئے نامزد کرے گی۔ مگر اس کی امید پوری نہ ہو سکی۔ ۱۸۵۵ میں وہ سینٹ کے لئے کھڑا ہوا مگر ہار گیا۔ ۱۸۵۸ میں دوبارہ اس کو سینٹ کے الکشن میں شکست ہوئی۔ یہ بار بار ناکام ہونے والا شخص ابراہام لنکن (۱۸۰۹-۱۸۶۵) تھا جو بالآخر ۱۸۶۰ میں امریکہ کا صدر چنا گیا اور آج وہ نئے امریکہ کا معمار سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر نارمن ونسنٹ پیل نے لنکن کی کامیابی کا راز یہ بتایا ہے: HE KNEW HOW TO ACCEPT DEFEAT وہ جانتا تھا کہ شکست کو کس طرح تسلیم کیا جائے۔

مقابلہ کی سیاست ترک کرکے

دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹-۴۵) میں جاپان اور برطانیہ ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس جنگ میں جاپان نے بدترین شکست کھائی۔ مگر اس کے صرف ۲۰ سال بعد یورپ کے بازار جاپانی مصنوعات سے بھرے ہوئے تھے۔ جاپان نے ۱۹۷۳ میں برطانیہ اور دوسرے پانچ یورپی ملکوں میں ۲ بلین ڈالر کا سامان فروخت کیا۔ یورپ میں چھوٹے الکٹرانک سامان کی ۷۵ فی صد مارکٹ پر جاپان نے قبضہ کرلیا ہے۔ ۱۹۷۲ میں یورپ میں فروخت ہونے والی جاپانی کاروں کی تعداد ۳۶۸۰۲۵ تھی۔

جاپان کو کیسے یہ موقع ملا کہ وہ اپنے حریف کی اقتصادیات پر اس طرح چھا جائے، انگلستان میں مقیم ایک جاپانی تاجر سے جب یہ سوال کیا گیا تو اس نے جواب دیا:

I SURRENDERED MY SWORD TO A BRITISH
OFFICER AT THE END OF WORLD WAR II

Time (New York) August 6, 1973

دوسری جنگ عظیم کے بعد میں نے اپنی تلوار ایک برطانی افسر کے حوالے کردی تھی۔ مقابلہ کی سیاست میں جاپان کو شکست ہوگئی۔ جاپان نے مقابلہ کو ترک کرکے تعمیری شعبوں میں اپنے کو مستحکم کرنا شروع کردیا۔ جدوجہد کے میدان کی تبدیلی کارگر ثابت ہوگئی۔ جاپان نے "ترکِ سیاست" سے وہ مقصد زیادہ بہتر طور پر حاصل کرلیا جس کو "سیاست" کے ذریعہ حاصل کرنے میں وہ ناکام ہوگیا تھا۔

عدم تشدد کا ہتھیار تشدد سے زیادہ سخت ثابت ہوا

ہندستان میں انگریزوں کے خلاف آزادی کی تحریک ۱۸۵۷ میں شروع ہوئی۔ ابتدائی ۵۰ سال تک یہ تحریک تشدد کے طریقہ پر چلتی رہی۔ ۱۹۱۹ میں مہاتما گاندھی ہندوستان کی سیاست میں داخل ہوئے تو انھوں نے اعلان کیا کہ وہ اہنسا کی بنیاد پر آزادی کی تحریک چلائیں گے۔

انگریز حکمراں کے لئے گاندھی جی کا عدم تشدد کا ہتھیار پچھلے "مجاہدین آزادی" کے تشدد کے ہتھیار سے زیادہ سخت ثابت ہوا۔ تشدد کو تشدد کے ذریعہ ختم کرنے کا ان کے پاس کافی وجہ جواز تھا۔ مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ عدم تشدد کے اصول پر اٹھنے والے طوفان کا مقابلہ کس طرح کریں۔ جب یہ صورت حال سامنے آئی تو ایک پرانے انگریز کلکٹر نے سکریٹریٹ کو تار دیا:

KINDLY WIRE INSTRUCTIONS HOW
TO KILL A TIGER NON-VIOLENTLY

براہِ مہربانی بذریعہ تار ہدایات بھیجئے کہ ایک شیر کو تشدد کے بغیر کس طرح ہلاک کیا جائے ــــــ

اکثر لوگ سیاست کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ حریف سے لامتناہی لڑائی جاری رکھی جائے۔ مگر اصل سیاست یہ ہے کہ خاموش تدبیر کے ذریعہ حریف کو اس طرح بے ہتھیار کردیا جائے کہ وہ لڑنے کے قابل نہ رہے

حقیقی واقعہ صرف حقیقی عمل کے ذریعہ وجود میں آتا ہے

آپ کے کمرہ کی دیوار پر جو کیلنڈر ہے، اس پر ۱۹۷۷ کا سنہ لکھا ہوا ہے۔ اگر آپ چاہیں کہ کیلنڈر کے اوپر ۲۰۷۷ کا سنہ لکھا ہوا نظر آئے تو اس کے لئے آپ کو پوری ایک صدی تک انتظار کرنا پڑے گا۔ ایک خود ساختہ کیلنڈر پر آپ جو ہندسہ چاہیں اپنے ہاتھ سے لکھ لیں۔ مگر وہ کیلنڈر جو دنیا کے نزدیک بھی کیلنڈر ہو، اس پر ۲۰۷۷ کا ہندسہ دیکھنے کے لئے سو سالہ انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

اس دنیا میں کیلنڈر کے لئے جو قانون ہے، وہی ملی تعمیر کا بھی قانون ہے، نعروں اور جوشیلی تقریروں میں ملت کا مستقبل دیکھنا ہو تو کسی بھی صبح و شام لفظوں کا سیلاب بہا کر اس قسم کا ایک خیالی محل کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ مگر حقیقی مستقبل کی تعمیر طویل جد و جہد کے بغیر ممکن نہیں۔

محرومی اُس وقت محرومی ہے جب کہ وہ آدمی کے اندر تلخی اور مایوسی پیدا کرے۔ مگر محرومی اس وقت ترقی کا زینہ بن جاتی ہے جب کہ وہ آدمی کی دبی ہوئی قوتوں کو جگانے والی ثابت ہو ——————

بچوں کا گھروندا جتنی دیر میں بنتا ہے اس سے بھی کم مدت میں زمیں بوس ہوجاتا ہے

ایک طالب علم کے سرپرست کالج کے پرنسپل سے ملے ـــــ "آپ لوگوں نے جو تعلیمی نصاب بنایا ہے وہ بڑا طویل ہے۔ طالب علم کی عمر کا بڑا حصہ صرف پڑھنے میں گزر جاتا ہے۔" انھوں نے کہا۔

"اس کا حل تو بہت آسان ہے" پرنسپل نے جواب دیا۔ "آپ مختصر نصاب بھی بنا سکتے ہیں۔ اصل میں مدت کا تعلق اس بات سے ہے کہ آپ طالب علم کے اندر کس درجہ کی لیاقت دیکھنا چاہتے ہیں۔ قدرت کو شاہ بلوط (OAK) کا درخت تیار کرنے میں سو برس لگ جاتے ہیں مگر جب وہ ککڑی اگانا چاہتی ہے تو اس کے لیے صرف چند مہینے درکار ہوتے ہیں۔ اگر آپ معمولی قسم کا علمی معیار چاہتے ہوں تو چند سال کی تعلیم بھی کافی ہو سکتی ہے مگر اعلیٰ تعلیم یافتہ بنانے کے لیے تو بہرحال زیادہ وقت دینا پڑے گا۔"

یہی حال قومی تعمیر کا بھی ہے۔ اگر آپ ٹھوس اور دیرپا تعمیر چاہتے ہیں تو اس کے لیے آپ کو صبر آزما انتظار کے مرحلہ سے گزرنا ہوگا اور لمبے عرصہ تک مسلسل محنت کرنی پڑے گی۔ لیکن اگر آپ بچوں کا گھروندا بنانا چاہتے ہوں تو پھر صبح شام میں ایسا گھروندا بن کر کھڑا ہو سکتا ہے۔ البتہ ایسی حالت میں آپ کو اس حادثہ کا سامنا کرنے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے کہ جتنی دیر میں آپ کا گھروندا بن کر کھڑا ہوا ہے اس سے بھی کم مدت میں وہ دوبارہ زمیں بوس ہو جائے۔

ہوائیں چلتی ہیں تو گرد و غبار اٹھکر فضا میں اڑنے لگتے ہیں، مگر گرد و غبار کی پرواز کیلئے آخری طور پر جو انجام مقدر ہے، وہ یہ کہ دوبارہ وہ زمین پر گریں اور قدموں کے نیچے پامال ہونے کے لیے باقی رہ جائیں۔

مگر یہی ہوائیں پانی کے قطروں کو بھی پرواز پر آمادہ کرتی ہیں۔ مگر یہاں معاملہ بالکل مختلف ہوتا ہے قطرے فضا میں جاکر بادل بنتے ہیں، پھر وہ بارش کی شکل میں زمین پر برستے ہیں۔ اس کے بعد نالوں اور ندیوں سے ہوتے ہوئے سمندر میں پہنچتے ہیں اور بالآخر اس عظیم آبی چادر کا حصہ بن جاتے ہیں جو دائمی طور پر پورے کرۂ ارض کو لپیٹے ہوئے ہے۔

ایسا ہی کچھ معاملہ ہماری سرگرمیوں کا بھی ہے۔ سطحی اور غیر دانش مندانہ سرگرمیاں انسانوں کو صرف گڑھے میں گرانے کا باعث ہوتی ہیں اور جن سرگرمیوں کی بنیاد گہری بصیرت پر ہوتی ہے وہ آدمی کو ترقی کے آسمان پر پہنچا دیتی ہیں۔ پچھلے ڈیڑھ سو برس کے درمیان ہم نے اس ملک میں قومی تعمیر کے نام سے زبردست ہنگامہ آرائی کی ہے مگر یہ کوششیں اس انجام پر ختم ہوئی ہیں کہ آج ہم صرف گرد راہ بن کر انسانی قافلوں کے قدموں کے نیچے پامال ہونے کے لیے پڑے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ہم کو جدوجہد کا جو طویل موقع ملا اور اسمیں جو سنہری امکانات ہمارے لیے چھپے ہوئے تھے اگر ہم نے دانش مندی کے ساتھ انھیں استعمال کیا ہوتا تو آج ہم زمین پر چھائے ہوئے ہوتے۔ فریاد و ماتم کے بجائے ہم فیصلہ کرنے والے کی پوزیشن میں ہوتے۔ ہمارے لیے آسمانی پرواز بھی مقدر تھی، مگر ہماری بے بصیرتی کی وجہ سے صرف زمین کی پامالی کا انجام ہمارے حصہ میں آیا ہے۔

کبھی سست رفتاری زیادہ عظیم ہوتی ہے

تار کول کی چکنی سڑک پر نئی کار تیزی سے پھسل رہی تھی۔ دوسری طرف سڑک کے کنارے ایک کسان ٹریکٹر کی پیٹھ پر ہچکولے کھا رہا تھا۔ وہ ٹیلوں اور کھائیوں کو ہموار کر رہا تھا تاکہ اس کو فصل اگانے کے قابل بنائے۔ کار کے لئے کوئی ٹھہراؤ نہیں تھا جب کہ ٹریکٹر کو جگہ جگہ ٹھوکر لگ رہی تھی۔ اس کو بار بار رکنا پڑتا تھا۔

کار کے مقابلہ میں ٹریکٹر کی یہ حالت کسی بھی درجہ میں اس کی اہمیت کو نہیں گھٹاتی — کار بنے بنائے راستہ پر دوڑ رہی ہے، جب کہ ٹریکٹر خود اپنا راستہ بنا رہا ہے۔ ایک ماضی میں سفر کر رہا ہے، دوسرا مستقبل کی طرف مارچ کر رہا ہے۔ ایک تاریخ کے اندر گم ہے، دوسرا اپنی جدوجہد سے خود ایک تاریخ بنا رہا ہے۔

ٹریکٹر کی سست رفتاری میں جو عظمتیں چھپی ہوئی ہیں، اس کے مقابلہ میں کار کی تیز رفتاری کی کوئی حقیقت نہیں۔

دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک خود اپنے لئے مفید ہوتا ہے

شیخ سعدی شیرازی (۶۹۱ — ۵۸۹ ھ) کی کتاب بوستاں کے شروع میں ایک حکایت درج ہے۔ اس کا عنوان ہے: "پند دادن کسرے ہرمزرا"۔ اس حکایت کے مطابق ایران کا بادشاہ نوشیرواں جب مرض الموت میں مبتلا ہوا تو اس نے اپنے جانشین ہرمز کو بہت سی نصیحتیں کیں۔ ان میں سے ایک نصیحت، سعدی کے الفاظ میں، یہ تھی:

مراعات دہقاں کن از بہر خویش   کہ مزدور خوش دل کند کار بیش

یعنی چودھریوں اور سرداروں کے ساتھ رعایت کرو، اس سے خود تم کو فائدہ ہوگا۔ کیوں کہ مزدور جب خوش ہو تو وہ کام زیادہ کرتا ہے۔

یہ کام ہے یا لیڈری

ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی (۱۹۱۳-۱۹۷۴) ابتدا میں آل انڈیا امن کونسل کے ممبر تھے۔ اس کے بعد اس سے علیحدہ ہو گئے اور اولاً آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت اور اس کے بعد مسلم مجلس کے ذریعہ کام کرتے رہے۔ امن کونسل سے اپنی علیحدگی کے بارے میں ایک شخص کو انٹرویو دیتے ہوئے انھوں نے کہا تھا :

"جب جبل پور میں بدامنی (۱۹۶۳) ہوئی تو میں نے کونسل سے کہا کہ چلو جبل پور چل کر کچھ کام کریں۔ مگر ان لوگوں نے میری بات نہ مانی۔ وہ بین الاقوامی امن کی بات تو کرتے تھے۔ مگر انھیں گھر کی بدامنی رفع کرنے کے کام سے دلچسپی نہ تھی۔ مجھے یہ بات عجیب سی لگی اور محسوس ہوا کہ ایسی تنظیم سے میرا تعلق رکھنا بے کار سی بات ہے۔ اس لئے میں نے استعفا دے دیا" (الحسنات اگست ۱۹۷۷)

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے جو بات امن کونسل کے بارے میں کہی، وہ صد فی صد صحیح ہے، صرف اس اضافہ کے ساتھ کہ خود ہمارے رہنماؤں کا حال بھی یہی ہے۔ ہمارا تقریباً ہر رہنما، خواہ وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی، عالمی کاموں سے خصوصی دلچسپی رکھتا ہے۔ اپنے گھر، اپنے محلہ، اپنے ادارہ اور اپنے قریبی دائرہ میں اس کے لئے جو کام ہیں، اس میں مصروف ہونا وہ اپنے لئے چھوٹی بات سمجھتا ہے۔ اس کے برعکس آل انڈیا اجتماعات کی صدارت اور بین اقوامی نمائش گاہوں میں تقریری کمال دکھانا اس کو زیادہ پسند ہے۔ موجودہ زمانہ میں ملت کی بربادی کی، اگر کُل نہیں تو کم از کم ایک بڑی وجہ، یقیناً یہی ہے۔

اللہ کے سامنے سرخروئی حاصل کرنے کا جذبہ آدمی کو اپنی ذاتی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ مگر انسانوں کے سامنے سرخروئی حاصل کرنے کا شوق ہو تو آدمی کو "باہر" کی فکر زیادہ ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ عام انسانوں کو وہی "کام" زیادہ نظر آتے ہیں جو دور دور کئے گئے ہوں۔

سفر ابتدا سے شروع ہوتا ہے نہ کہ درمیان سے

سفر کا آغاز جب بھی ہوگا وہیں سے ہوگا جہاں آدمی فی الواقع کھڑا ہوا ہے —— ایک شخص دہلی میں ہے اور بمبئی پہنچنا چاہتا ہے، ایسے شخص کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ دادر سے اپنا سفر شروع کرے۔ اس کو بہر حال دہلی سے چلنا ہوگا۔ دادر سے سفر شروع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ سفر کبھی شروع ہی نہ ہو۔

"We must start again from scratch . . ."

ہم کو ابتدائی نقطہ سے اپنا سفر شروع کرنا ہے
کوئی شخص اگلی منزل سے اپنے سفر کا آغاز نہیں کر سکتا۔

الٹی سمت میں

ایک لطیفہ ہے کہ دہلی میں ایک مسافر کناٹ پلیس کی سڑک پر چل رہا تھا۔ اس کو پارلیمنٹ ہاؤس جانا تھا۔ مگر اس کا رخ الٹی طرف تھا۔ اس نے راستہ میں ایک شخص سے پوچھا: "پارلیمنٹ ہاؤس یہاں سے کتنی دور ہوگا" جواب دینے والے نے کہا "تقریباً ۲۵ ہزار میل"۔ مسافر یہ سن کر گھبرا گیا۔ "جناب میں آپ سے راستہ پوچھ رہا ہوں اور آپ مجھ سے مذاق کر رہے ہیں" اس نے کہا: معاف کیجئے گا۔ میں نے مذاق نہیں کیا۔ اصل میں آپ پارلیمنٹ ہاؤس کے الٹی طرف چل رہے ہیں۔ اس لئے اگر آپ یوں ہی چلتے رہے تو زمین کا پورا چکر کرنے کے بعد ہی آپ اپنی منزل پر پہنچ سکیں گے جس کی گولائی ۲۵ ہزار میل ہے۔" یہ بات بھی اس وقت ہے جب کہ آپ عرض البلد کے ٹھیک اس خط پر چل رہے ہوں جس پر پارلیمنٹ ہاؤس واقع ہے۔ اگر آپ کچھ دائیں بائیں ہوگئے تو زمین کا بار بار چکر کرنے کے بعد بھی آپ اپنی منزل کو پانے سے محروم رہیں گے۔"

پارلیمنٹ ہاؤس کا کوئی مسافر اس قسم کی غلطی نہیں کرے گا۔ کیونکہ لوگ اپنے دنیوی معاملات میں اتنے نادان نہیں ہوتے کہ اپنی غلطی واضح ہونے کے بعد بھی بدستور الٹی راہ پر چلتے رہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ دین کے شدید تر معاملہ میں بیشتر لوگ اسی غلطی میں مبتلا ہیں۔ واضح کرنے والے ان کی غلطیاں واضح کرتے ہیں۔ ان کا دل بھی گواہی دیتا ہے کہ میں غلطی پر ہوں۔ مگر شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ اس کو عزت کا سوال بنا لیتے ہیں۔ "اگر میں نے اس کے کہنے سے اپنی غلطی مان لی تو میں چھوٹا ہو جاؤں گا" یہ احساس ان کے لئے رکاوٹ بن جاتا ہے۔ وہ بدستور غلط راستہ پر چلتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ تباہی کے گڑھے میں جا گرتے ہیں۔ احیاء ملت کا سفر بھی موجودہ زمانہ میں کچھ اسی نوعیت کا ہوگیا ہے۔ لوگ الٹی سمت میں بھاگے جا رہے ہیں وہ بھول گئے ہیں کہ الٹی سمت میں سفر آدمی کو منزل سے اور دور کر دیتا ہے نہ کہ اس سے قریب۔

مسائل کا حل خاموش منصوبہ میں نہ کہ پُر رونق ہنگاموں میں

اسرائیل کے وزیر اعظم مسٹر بیگن سے پوچھا گیا "کیا اسرائیل اس کے لئے تیار ہے کہ مقبوضہ مغربی اردن اور فلسطینیوں کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے گفتگو کرے"، انھوں نے جواب دیا:

WE WILL FIND A SOLUTION TO THE PALESTINIAN PROBLEM, BUT NOT IN FRONT OF THE TELEVISION CAMERAS

ہم فلسطینی مسئلہ کا حل پالیں گے۔ مگر ٹیلی وژن کیمروں کے سامنے نہیں۔ (ٹائمس آف انڈیا ۱۳ دسمبر ۱۹۷۷)

قوموں کے مسائل کا حل خاموش منصوبہ بندی میں ہوتا ہے۔ مگر اکثر قائدین اس کو پُر رونق ہنگاموں میں تلاش کرتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ اس طرح دو فائدوں میں سے کم از کم ایک فائدہ یقینی طور پر حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کے ذریعہ قائد کی اپنی شخصیت بہرحال نمایاں ہو جاتی ہے۔ خواہ قوم کا مسئلہ حل ہو یا نہ ہو۔

کامیابی کا راز یہ ہے کہ ــــــ آدمی اپنی ناکامی کے راز کو جان لے

●●●

پختگی اس صلاحیت کا نام ہے کہ آدمی ان چیزوں کے ساتھ پرامن طور پر رہ سکے جن کو وہ بدل نہیں سکتا۔

پختگی انکساری کا نام ہے۔ ایک پختہ انسان یہ کہنے کا حوصلہ رکھتا ہے کہ "میں غلطی پر تھا"

●●●

سورج ایک بے حد روشن حقیقت ہے۔ مگر جو شخص اپنی آنکھیں بند کرلے، اس کے لئے سورج کا کوئی وجود نہیں۔

●●●

ذاتی نقصان کا اندیشہ ہو تو آدمی فوراً حقیقت پسندانہ انداز میں سوچنے لگتا ہے۔ مگر ملی معاملات میں دلائل کا انبار بھی کسی کو حقیقت پسند بنانے کے لئے کافی نہیں۔

●●●

کبھی جاننا اس کا نام ہوتا ہے کہ آدمی یہ کہہ دے کہ "میں نہیں جانتا"

اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ کیجئے آپ کو دوسروں سے کوئی شکایت نہ ہوگی

پتھر ہر ایک کے لئے سخت ہے۔ البتہ وہ اس کے لئے نرم ہوجاتا ہے جس نے اس کو توڑنے کا اوزار فراہم کرلیا ہو ــــــ یہی صورت ہر معاملہ میں پیش آتی ہے۔ اگر آپ لیاقت اور اہلیت کے ساتھ زندگی کے میدان میں داخل ہوں تو ہر جگہ آپ اپنا حق وصول کرکے رہیں گے۔ اور اگر لیاقت اور اہلیت کے بغیر آپ نے زندگی کے میدان میں قدم رکھا ہے تو آپ کے لئے اس دنیا میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اپنی مفروضہ حق تلفی کے خلاف فریاد و فغاں کرتے رہیں۔

ماحول سے کوئی امید نہ رکھئے، بلکہ اپنی محنت اور لیاقت پر بھروسہ کیجئے۔ آپ کو ماحول سے کبھی شکایت نہ ہوگی۔ ماحول کی شکایت دراصل ماحول سے زیادہ خود اپنی نالائقی کا اظہار ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے وہ ناگزیر تیاری نہیں کی تھی جو ماحول سے اپنا حق وصول کرنے کے لیے ضروری ہے۔

ناکامی کی وجہ

شریف کامل ایک اخوانی رہنما ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اخوان المسلمین کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ وہ سیاست میں قبل از وقت داخل ہوگئی: تدخلنا فی السیاسۃ قبل وقتھا

برتر سطح سے کام کرنے کا ذہن پیدا کیجئے

کسی شہر میں کپڑے کی دوکان نہ ہو تو ہر شخص جانتا ہے کہ یہ ایک سنہری موقع ہے جس کو استعمال کر کے کوئی شخص شہر میں ایک کامیاب دکان کا مالک بن سکتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہاں ایک اس سے بھی زیادہ بڑا خلا ہے جس کو ابھی تک کسی نے استعمال نہیں کیا۔ ہمارے ملک کے بھرے ہوئے دفاتر اور ہمارے پر رونق بازار جہاں ہر وقت خرید و فروخت کے ہنگامے جاری رہتے ہیں اپنی ساری ہماہمی کے باوجود ابھی تک خالی ہیں۔

آپ بازار سے کوئی ملک کی بنی ہوئی چیز خریدیں، چند ہی روز کے تجربے کے بعد آپ کو معلوم ہو گا کہ آپ کو اپنی پسند کی چیز نہیں ملی۔ آپ اپنے کام کے لئے ملازم رکھئے، بہت جلد آپ محسوس کریں گے کہ آپ جیسا کارکن چاہتے ہیں، آپ کا ملازم ان اوصاف میں پورا نہیں اترتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بازار اگرچہ سامانوں سے پٹے ہوئے ہیں مگر وہ ان چیزوں سے خالی ہیں جو حقیقتاً گاہک کو مطمئن کرنے والی ہوں۔ اسی طرح وہ جگہیں جہاں آدمی کو کام ملتا ہے اگرچہ بظاہر بھری ہوئی ہیں۔ مگر انھیں اب بھی ایسے کارکنوں کا انتظار ہے جو ان کی مرضی کے مطابق ان کا کام پورا کر سکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آج سارا ملک ایک عظیم خلا سے دوچار ہے۔ اور یہ خلا اعلیٰ مصنوعات اور بہتر کارکردگی کا خلا ہے۔ اگر کوئی گروہ ہو جو محنت اور عملی دیانتداری میں اعلیٰ معیار دکھا سکے۔ جو مثال کے طور پر جرمنی اور

کارکردگی کا خلاء پر کر کے آپ اپنے لئے جگہ حاصل کر سکتے ہیں۔

جاپان میں نظر آتا ہے، تو وہ آناً فاناً ملک کی اقتصادیات پر چھا جائے گا اور جو گروہ اقتصادیات پر قابض ہو جائے وہ لازمی نتیجہ کے طور پر دوسرے شعبوں پر بھی قابض ہو کر رہتا ہے۔

دنیا میں اپنی جگہ بنانے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ——— جس آسامی کے لئے بی اے کی قابلیت کی شرط ہو اور بی اے والوں نے درخواستیں دے رکھی ہوں۔ وہاں آپ بھی اپنی بی اے کی ڈگری لے کر پہنچ جائیں اور جب آپ کو نہ لیا جائے تو بحث کریں کہ کیوں آپ کے مقابلے میں دوسرے امیدوار کو ترجیح دی گئی جبکہ دونوں یکساں طور پر گریجویٹ تھے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ جہاں لوگ بی اے کی سندیں پیش کر رہے ہوں وہاں آپ ماسٹر ڈگری لے کر پہنچیں جہاں لوگ مطابق شرائط قابلیت کی بنیاد پر اپنا حق مانگ رہے ہوں وہاں آپ برتر از شرائط قابلیت دکھا کر اپنا حق تسلیم کرائیں۔

یہی دوسرا طریقہ زندگی کا اصل طریقہ ہے۔ تمام بڑی بڑی ترقیاں اور کامیابیاں انھیں کے لئے مقدر ہیں جو اس دوسرے طریقے کے مطابق کام کرنے کے لئے تیار ہوں۔

مسلم قیادت موجودہ زمانے میں سب سے زیادہ ناکام قیادت ثابت ہوئی ہے۔ اس کی وجہ اس کی یہ غلطی ہے کہ اس نے مسلمانوں کے مستقبل کو تعمیر کے بجائے سیاست میں تلاش کیا۔ سیاست بازی کا مطلب ہے، اپنے مسائل کے حل کے لئے دوسروں کے خلاف مہم چلانا۔ جب کہ تعمیر یہ ہے کہ اپنے مسائل کے لئے خود اپنے اوپر عمل کیا جائے۔

کرنے کا اصل کام یہ تھا کہ قوم کو اس حیثیت سے تیار کیا جائے کہ لوگوں کے عقائد مضبوط ہوں، ان کے اندر اخلاق کی طاقت ہو، وہ تعلیم میں اونچے ہوں، ان میں باہم اتحاد ہو اقتصادی شعبوں میں انھوں نے اپنی جگہ بنائی ہو۔ سماجی بہبود کے ادارے ان کے درمیان چل رہے ہوں۔ وہ زمانے کو پہچانیں اور اس کے مطابق کام کرنا جانتے ہوں۔ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے اندر وہ شعور ابھارا جائے کہ وہ صاحبِ نظریہ افراد کی حیثیت سے لوگوں کے درمیان رہ سکیں۔ انھیں چیزوں کے اوپر کسی قوم کی زندگی کا دارومدار ہے لیکن مسلمانوں نے دوسروں کے خلاف سیاسی ہنگامہ آرائی تو خوب کی، خود اپنی تعمیر کے لئے کوئی کام نہ کیا۔

مزید نادانی یہ ہے کہ سیاست بازی سے جب وہ کامیاب نہ ہوسکے تو اب انھوں نے دوسرا مشغلہ یہ اختیار کیا ہے کہ اپنی ناکامی کے لئے دوسروں کو ذمہ دار ٹھیرا رہے ہیں۔ حالانکہ اس قسم کی باتوں سے وہ صرف یہ بات ثابت کر رہے ہیں کہ قرآن کے الفاظ میں انھوں نے کلمۂ طیبہ کا درخت نہیں اگایا تھا، بلکہ کلمۂ خبیثہ کا درخت اگایا تھا۔ کیونکہ کلمہ طیبہ کے درخت کے لئے خدا کا اعلان ہے کہ کوئی اس کو اکھاڑ نہیں سکتا۔ یہ انجام صرف کلمہ خبیثہ کے درخت کے لئے مقدر ہے کہ جو چاہے ہاتھ بڑھا کر اس کو اکھاڑ لے۔ (ابراہیم)

ایمان یہ ہے کہ جب کوئی غیر معمولی بات پیش آئے تو آدمی کے اندر نفسانیت نہ جاگے بلکہ خداپرستی جاگے

آدمی کی زندگی میں مختلف قسم کے واقعات پیش آتے ہیں۔کبھی آرام کبھی تکلیف، کبھی تعریف کبھی تنقید۔ کبھی خوشی کبھی غم ——— یہ اتار چڑھاؤ سب امتحان کے پرچے ہیں۔ کامیابی یہ ہے کہ ان واقعات سے آدمی کے اندر نفسانیت نہ جاگے بلکہ خداپرستی جاگے۔ خوشی اور آرام ہو تو اس کے اندر شکر کا جذبہ ابھرے۔کسی سے کوئی تکلیف پہنچے تو اس کے اندر عجز اور عبدیت کی روح پیدا ہو۔

۱۹۷۵ میں شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے کابینی رفقاء مسٹر تاج الدین احمد، مسٹر قمر الزماں، مسٹر نذر الاسلام اور دوسرے بہت سے لوگ قتل کر دیئے گئے تھے۔ اس واقعہ سے کسی قدر پہلے اپریل ۱۹۷۵ میں بنگالی صحافی مسٹر سکھ رنجن داس گپتا ڈھاکہ گئے تھے اور بنگلہ دیش کے لیڈروں سے ملے تھے۔ انھوں نے بنگلہ دیش کے خونیں واقعات پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے:

The Midnight Massacre in Dacca

مسٹر گپتا کے بیان کے مطابق اپریل ۱۹۷۵ میں جب وہ دوسرے ہندوستانی صحافیوں کے ساتھ ڈھاکہ پہنچے تو وہاں مجیب حکومت کو ختم کرنے کی افواہیں گرم تھیں۔ مسٹر قمر الزماں سے جب وہ ان کی رہائش گاہ پر ملے تو موصوف کے الفاظ ہیں:

The first thing he asked for was the tin of Zarda

پہلی چیز جو انھوں نے مجھ سے مانگی وہ زردہ تھا۔ میں نے بتایا کہ میں ان کے لئے زردہ کا ایک ڈبہ لایا ہوں۔

مسٹر تاج الدین سے جب وہ ان کے مکان پر ملے تو انھوں نے مسٹر گپتا سے فرمائش کی کہ وہ ایشور چند ودیا ساگر کی کتابیں پڑھنا چاہتے ہیں۔ یہ کتابیں ان کو فراہم کر دی گئیں۔ مسٹر خوندکر مشتاق جو اس وقت ٹریڈ اور کامرس کے منسٹر تھے، انھوں نے شکایت کی کہ کلکتہ کے اخبارات نے اپنے صفحات میں ان کو اتنی جگہ نہیں دی جتنی انھوں نے مسٹر تاج الدین اور مسٹر نذر الاسلام کو دی۔ مسٹر داس گپتا لکھتے ہیں میں سمجھ نہ سکا کہ وہ شیخ مجیب کے خلاف اپنی شکایت کو میرے جیسے ایک غیر ملکی صحافی سے کیوں بیان کر رہے ہیں

"۲۵ مارچ ۱۹۷۱ کو پاکستانی فوج نے بنگلہ دیش میں مار دھاڑ کیوں شروع کی"، مسٹر تاج الدین نے بتایا کہ الیکشن کے بعد ہم نے خفیہ منصوبہ بنایا کہ بنگلہ دیش کی مکمل آزادی کا اعلان کر دیں۔ یہ منصوبہ خوندکر مشتاق کے ذریعہ پاکستان کے لیڈروں تک قبل از وقت پہنچ گیا اور انھوں نے فوجی کارروائی شروع کر دی"

کام کا آغاز خود اپنی ذات سے

"ہماری قوم جاہل ہے، آپ اس کی جہالت دور کرنے کے لئے کیوں نہیں اُٹھتے"
"آپ نے خود کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے"
"میں تو بدقسمتی سے کوئی تعلیم حاصل نہ کرسکا"
"پھر آپ یہ کیجئے کہ فوراً کسی تعلیمی ادارہ میں داخلہ لے لیجئے۔ اگر آپ نے پڑھ لیا تو قوم کا کم سے کم ایک جاہل کم ہو جائے گا"

دو شخصوں کی یہ گفتگو بتاتی ہے کہ موجودہ حالات میں ہمارے کرنے کا کام کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ دوسروں کو تلقین کرنے کے بجائے ہر شخص اپنے کام میں لگ جائے۔ زندہ قوم کی علامت یہ ہے کہ اس کا ہر شخص "میں کیا کروں" کے سوال پر سوچتا ہے۔ اس کے برعکس جب قوم کے افراد "دوسرے کیا کریں" کے سوال پر بحث کرنے لگیں تو سمجھنا چاہئے کہ قوم مرچکی ہے۔ اس قسم کی حرکت موت کی حرکت ہے نہ کہ زندگی کی حرکت۔

اقدام سے پہلے تیاری ضروری ہے

عربی کا ایک مثل ہے: قبل الرّمی یُراش السھم (تیر مارنے سے پہلے تیر کو کمان میں ٹھیک طریقے سے جمایا جاتا ہے) تیر کو کمان میں اچھی طرح بٹھائے بغیر یونہی چلا دیا جائے تو وہ کبھی نشانہ پر نہیں لگے گا۔ اسی طرح کوئی اقدام ضروری تیاری کے بغیر کیا جائے تو اس کا ناکام ہونا یقینی ہے۔

یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے

مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۱۴ میں "دارالارشاد" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا۔ ادارہ کے مقاصد بیان کرتے ہوئے انھوں نے لکھا:

"ہمارے کاموں کی بڑی قسمیں صرف دو ہی ہیں — مسلمانوں کی داخلی اصلاح و احیائے علم و عمل، اور غیر قوموں میں اسلام کی تبلیغ۔ یہ دونوں کام بغیر کسی ایسی جماعت کی موجودگی کے انجام نہیں پا سکتے۔ جس قدر تحریکیں، انجمنیں، کانفرنسیں اور متفرق کوششیں بغیر اس کے ہوں گی، وہ اسی طرح ضائع ہو جائیں گی جس طرح اب تک ضائع ہو چکی ہیں۔" البلاغ ۱۲ نومبر ۱۹۱۵

چالیس سال پہلے مولانا آزاد کا یہ تجزیہ کس قدر صحیح تھا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ دنوں بعد وہ ان دونوں کاموں کو چھوڑ کر "متفرق کوششوں"، بالفاظ دیگر سیاست کی لائن پر چل پڑے۔ اگرچہ وہ آخر وقت تک یہی اعلان کرتے رہے کہ "میں نے ۱۶ سال کی عمر میں اپنے لئے جو راستہ مقرر کیا تھا، اسی پر میں آج بھی قائم ہوں۔"

یہی موجودہ زمانہ میں تقریباً تمام شخصیتوں کا حال ہوا ہے۔ وہ آغاز میں ایک خالص دینی مقصد لے کر اٹھیں۔ مگر دھیرے دھیرے ان کی گاڑی سیاست کی پٹری پر اتر گئی۔ مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ ہر ایک آخر وقت تک یہی اعلان کرتا رہا کہ وہ اب بھی اسی مقصد پہ قائم ہے جو اس نے شروع میں اپنے سامنے رکھا تھا۔

وقت گزرنے کے بعد

۳۰ جنوری ۱۹۴۸ کو مہاتما گاندھی کو گولی سے ہلاک کر دیا گیا تھا۔ اس وقت سے ہر سال یہ دن "یوم شہیداں" کے طور پر منایا جاتا ہے۔ ۳۰ جنوری ۱۹۷۸ کو اس موقع پر جو تقریبات ہوئیں، ان میں سے ایک یہ تھا کہ برطانی نوبل انعام یافتہ لارڈ فلپ نوئل بیکر کو لکچر کے لئے مدعو کیا گیا۔ اس اجتماع کی صدارت مسٹر اٹل بہاری باجپئی نے انجام دی۔

مسٹر باجپئی، جو اس وقت ہندستان کے وزیر خارجہ ہیں، ۱۹۴۸ میں ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی (ہندو مہاسبھا) کے پرسنل سکریٹری تھے۔ مسٹر باجپئی کی صدارتی تقریر کی جو رپورٹ اخبارات میں آئی ہے، اس کا ایک حصہ یہ ہے۔

MR ATAL BEHARI VAJPAYEE, EXTERNAL AFFAIRS MINISTER, CONFESSED HERE TODAY THAT HE HAD FOUND MAHATMA GANDHI WANTING AT THE TIME OF INDIA'S PARTITION IN HIS APPROACH TO THE COMMUNAL QUESTION.

The Times of India, 31.1.1978

وزیر خارجہ مسٹر اٹل بہاری باجپئی نے اپنی تقریر میں اعتراف کیا کہ اُس وقت ان کا خیال تھا کہ مہاتما گاندھی نے ملک کی تقسیم کے وقت فرقہ وارانہ سوال پر جو موقف اختیار کیا، وہ قومی معیار سے گرا ہوا تھا۔ (مگر اب وہ سمجھتے ہیں کہ مہاتما گاندھی کا موقف ہی درست تھا)

حقیقت پسند رہنماؤں کے ساتھ اکثر یہ المیہ پیش آتا ہے کہ ان کے وقت کے پر جوش لوگ ان کے موقف کو پست ہمتی کا موقف سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ بعد کے حالات ثابت کرتے ہیں کہ وہی زیادہ صحیح اور قابلِ عمل تھا۔

صحیح کوشش کرنے والے کے لئے

ناکامی کا سوال نہیں

جو حرکت کرنا چاہے اس کا راستہ کبھی بند نہیں ہوتا ـــــ گیس نیچے نہیں سماتی تو اوپر اٹھ کر اپنے لیے جگہ حاصل کرلیتی ہے۔ پانی کو اونچائی آگے بڑھنے نہیں دیتی تو وہ نشیب کی طرف بہہ کر اپنا راستہ بنالیتا ہے۔ درخت سطح پر قائم نہیں ہوسکتا تو وہ زمین کو پھاڑ کر اس سے اپنے لئے زندگی کا حق وصول کرتا ہے۔

یہی طریقہ آپ کو بھی اختیار کرنا ہے، آپ کا پہلا کام یہ ہے کہ اپنے آپ کو سمجھیں، اپنی قوتوں کو صحیح ڈھنگ سے ترتیب دیں اور پھر ماحول کو سمجھ کر ماحول کے اندر اس طرح گھسیں کہ اسکے مقابلہ میں اپنی اہلیت ثابت کرنے کے لئے آپ پوری طرح مسلح ہوں۔ حالات سے اپنی اہمیت منوانے کے لئے آپ نے ضروری سامان کرلیا ہو

لیاقت پیدا کیجئے اور دانش مندی کے ساتھ اپنے لئے راہ نکالئے، اس کے بعد آپ کو کبھی ماحول سے شکایت نہ ہوگی۔ زندگی کی کسی منزل پر آپ اپنے کو ناکام محسوس نہیں کریں گے۔ ناکامی اور مایوسی صرف وہیں آتی ہے جہاں زندگی کی ضروری شرطیں پوری کرنے میں کوئی کوتاہی رہ گئی ہو۔

ناکافی تیاری کے ساتھ کیا ہوا اقدام مسئلہ کو پہلے سے زیادہ سنگین بنا دیتا ہے

ڈیگال ازم: اپنی مقبولیت کی قیمت پر قوم کے مستقبل کی تعمیر

ہندوستان کے وزیر خارجہ مسٹر اٹل بہاری باجپئی نے فروری ۱۹۷۸ کے پہلے ہفتہ میں پاکستان کا دورہ کیا۔ اس موقع پر پاکستان کے فوجی حکمراں جنرل ضیاء الحق نے اخبار نویسوں سے بات کرتے ہوئے کہا:

THE BEST DESCRIPTION I CAN GIVE OF MR VAJPAYEE IS THAT AS A POLITICIAN IN OFFICE HE IS DIFFERENT FROM WHAT HE WAS IN THE OPPOSITION.

مسٹر باجپئی کے بارے میں بہترین الفاظ جو میں کہہ سکتا ہوں، وہ یہ کہ بحیثیت وزیر حکومت وہ اس سے مختلف ہیں جیسے کہ وہ اس وقت تھے جب کہ وہ اپوزیشن میں تھے۔

دونوں ملکوں کے لیڈروں کے درمیان اسلام آباد میں جو گفتگو ہوئی، اس میں کشمیر کا مسئلہ نمایاں رہا۔ اس واقعہ کے باوجود کہ دونوں ممالک اپنے تعلقات کو مستحکم بنانے کے لئے پوری طرح سنجیدہ تھے، طرفین نے محسوس کیا کہ کشمیر کا مسئلہ دونوں کے تعلقات کو معمول پر لانے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، کیونکہ:

THE PUBLIC OPINION IN INDIA WAS VERY SENSITIVE ON THIS SUBJECT.

ہندستان کی رائے عامہ اس مسئلہ کے بارے میں بے حد حساس ہے۔ دوسری طرف جنرل ضیاء الحق نے صفائی کے ساتھ کہا کہ بنیادی مشکل یہ ہے کہ:

WE ARE ALLERGIC ON KASHMIR

کشمیر کے معاملہ میں ہم پاکستانی الرجک واقع ہوئے ہیں۔

ٹائمس آف انڈیا، ۷ فروری ۱۹۷۸

یہ اخباری رپورٹ بتاتی ہے کہ موجودہ زمانہ کی "جمہوری سیاست" کس تضاد سے دوچار ہے۔ ایک لیڈر جب تک ایوان حکومت کے باہر ہوتا ہے، وہ آتشین تقریریں کرتا ہے، کیونکہ ہندو پاک جیسے علاقہ میں عوامی لیڈر بننے کا یہ سب سے آسان طریقہ ہے۔ مگر اس کی سیاسی مقبولیت جب اس کو حکومت کی کرسی پر پہنچا دیتی ہے تو معاملہ بدل جاتا ہے۔ اب اس کو محسوس ہوتا ہے کہ حکومت کا انتظام چلانے کے لئے حقیقت پسندی کی ضرورت ہے۔ مگر یہاں عوام کی وہی جذباتیت، حقیقت پسندانہ سیاست کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے جو اس سے پہلے حزب اختلاف کی سیاست چلانے کے لئے سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہوئی تھی۔ اس تضاد کا واحد حل "ڈیگال ازم" ہے یعنی اپنی مقبولیت کی قیمت پر ملک کے مستقبل کی تعمیر۔ جنرل ڈیگال (۱۹۷۰-۱۸۹۰) نے الجیریا کو آزاد کرکے اچانک فرانس کو یورپ کا سب سے طاقتور ملک بنا دیا۔ اگرچہ اس کے بعد ڈیگال کی اپنی سیاسی زندگی ختم ہوگئی ——— ڈیگال ازم عملاً سیاسی خودکشی کے ہم معنی ہے۔ اور خودکشی کی معروف قسم جتنی عام ہے، یہ دوسری قسم اتنی ہی کمیاب ہے۔

حقیقی لیڈر وہی ہے جو قوم کو حقیقی عمل چیز دے سکے۔ اور ایسا اسی وقت ہوتا ہے جب کہ لیڈر ہر حال میں حقیقت پسندانہ سیاست چلائے خواہ اس کی وجہ سے اپنی کامیابی کے لئے اس کو کتنی ہی لمبی مدت تک انتظار کرنا پڑے۔ اور اگر بالفرض اس کو وراثت میں ایک جذباتی سیاست کا ماحول ملے تو وہ اپنی مقبولیت کو خطرہ میں ڈال کر فیصلہ کر سکے۔

قومی رہنمائی کے کام کے لیے صرف انھیں لوگوں کو اٹھنا چاہیے جو حال کے اندر مستقبل کو دیکھ سکتے ہوں۔ جن کے اندر یہ صلاحیت نہ ہو، ان کا قومی رہنما بن کر اٹھنا، قومی جرم ہے نہ کہ قومی خدمت

چودھری خلیق الزماں (۱۹۷۳ - ۱۸۸۸)

پاکستان تحریک کے بانیوں میں سے تھے۔ انھیں اپنے اوپر اتنا اعتماد تھا کہ انھوں نے کہا: "نہرو سے زیادہ سیاست میرا کوچوان جانتا ہے۔" انھوں نے ایک کتاب بھی لکھی ہے جس میں دکھایا ہے کہ پاکستان کے اصل بانی وہی تھے۔ یہ انھیں کا تخیل تھا اور اس وقت تھا جب کہ مسٹر جناح بھی اس کے خلاف تھے۔

مگر آخر عمر میں چودھری صاحب کو یہ احساس ہو گیا کہ انھوں نے تقسیم ملک کی جو تحریک چلائی وہ غلط تھی۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور (۱۲ اپریل ۱۹۶۷ء) میں ان کا ایک انٹرویو چھپا تھا۔ اس سے پھر روزنامہ جنگ میں نقل ہوا۔ اس انٹرویو کا ایک حصہ یہ تھا:

"ممتاز مسلم لیگی لیڈر چودھری خلیق الزماں نے روزنامہ "جنگ" کے نمائندہ کو ایک ملاقات میں انٹرویو دیا اور برصغیر کی تقسیم کے بارے میں تفصیل سے اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ موجودہ حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے یہ تقسیم کرا کر ہندوستان کے مسلمانوں کو کمزور کیا اور جن عظیم مقاصد کے لیے پاکستان قائم کیا تھا وہ بھی حاصل نہ ہو سکے۔ اب ہم ایک کوزہ میں بند ہو گئے ہیں۔ ہندوستان میں اب بھی ۵-۶ کروڑ مسلمان ہیں۔ جن کی ہم کوئی خدمت نہیں کر سکتے۔ اس صورت میں کون کہہ سکتا ہے کہ تقسیم ہند کرا کر ہم نے کوئی فائدہ حاصل کیا۔"

روزنامہ جنگ، راولپنڈی۔ ۱۳ اپریل ۱۹۶۷ء صفحہ ۳

اس میں ہم صرف اتنا اضافہ کریں گے کہ موجودہ زمانے میں ہمارے تمام قائدین، خواہ وہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی، چودھری خلیق الزماں ہی کی مثال ثابت ہوئے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ بعض لوگ مرتے ہوئے چودھری صاحب کی طرح اپنا اقرار نامہ لکھ کر قوم کو دے گئے۔ اور بیشتر کا حال یہ رہا کہ آخر وقت تک وہ یہی کہتے رہے یا کہہ رہے ہیں کہ انھوں نے جو راہ اختیار کی وہی صحیح ترین راہ تھی۔ حالات کے بگاڑ میں ان کا اپنا کوئی حصہ نہیں۔

زندگی کا راز

جو کم پر راضی ہو جائے
وہی زیادہ پاتا ہے۔

جو زیادہ کے لئے دوڑے
وہ کم سے بھی محروم رہتا ہے
اور زیادہ سے بھی۔

نپولین کا نام فوجی تاریخ میں عظمت کا نشان ہے۔ مگر وہ ایک پستہ قد آدمی تھا اگرچہ فربہ اندام تھا۔ ایک دن وہ پریڈ گراؤنڈ میں معمولی لباس میں کھڑا تھا اتنے میں اس کا ایک فوجی پیچھے سے آیا اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ کوئی معمولی سپاہی ہے، نپولین کے اوپر سے ہائی جمپ کر گیا۔ اس کے بعد وہ فخریہ انداز میں پلٹا اور کھڑے والے شخص کے سامنے سے اس کے چہرہ پر نظر ڈالی تو وہ نپولین تھا جو سنجیدگی کے ساتھ اپنے فوجی کی طرف دیکھ رہا تھا فوجی نے جب اس طرح اچانک اپنے عظیم کمانڈر نپولین کو دیکھا تو وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا اور فوراً مر گیا۔

معلوم ہوا کہ طاقت کا اصل سرچشمہ خود آدمی کا اپنا احساس ہے۔ وہی نپولین ہے اور وہی فوجی۔ مگر ایک بار وہ نپولین کے سر سے فخریہ انداز میں پھاند جاتا ہے اور دوسری بار اس کو دیکھتے ہی اتنا بدحواس ہوتا ہے کہ فوراً مر جاتا ہے۔

یہ دونوں احساس کے کرشمے ہیں اگر آپ کا دل بے خوف ہے تو آپ شیر سے لڑ سکتے ہیں اور دریاؤں کو پھلانگ سکتے ہیں۔ لیکن اگر دل میں شبہ اور دہشت پڑا ہو تو گیدڑوں کا غول بھی آپ کو بوکھلا دے گا اور معمولی نہریں بھی آپ کو ڈبانے کے لیے کافی ہوں گی۔

اوپر ہم نے نپولین کے فوجی کی جو مثال پیش کی ہے، وہ اس صورت حال سے متعلق تھی کہ ایک طاقتور شخص کس طرح دل کی گھبراہٹ کی وجہ سے اپنی موجودہ طاقت بھی کھو بیٹھتا ہے۔ اب ایک ایسی مثال لیجیے جبکہ ایک کمزور اور شکست خوردہ آدمی محض دل کی کیفیت بدل جانے کی وجہ سے دوبارہ فتح و کامیابی کا مالک بن جاتا ہے۔

اسکاٹ لینڈ کے رابرٹ بروس (ROBERT BRUCE) نے انگلینڈ کے بادشاہ کنگ ایڈورڈ اوّل کے خلاف بغاوت کر دی تھی جو کہ اسکاٹ لینڈ کے اوپر اقتدار اعلیٰ کا دعویدار تھا اس کو ۱۳۰۶ء میں "کنگ آف اسکاٹ لینڈ" کا تاج پہنا یا گیا۔

اس مقابلہ میں رابرٹ بروس کو بری طرح شکست ہوئی اور اس کو جنگلوں اور بیابانوں میں پناہ لینا پڑی۔ مگر ۱۳۱۴ء میں اس نے دوبارہ انگلینڈ کے بادشاہ ایڈورڈ دوم سے بناک برن میں جنگ کی اور اس کو شکست دی۔ اور اسکاٹ لینڈ کو انگریزوں سے آزاد کرا لیا۔ اس کے بعد "رابرٹ اول" کے نام سے اس نے ۱۳۲۹ء تک اسکاٹ لینڈ پر حکومت کی۔

رابرٹ بروس کو شکست کے بعد فتح کس طرح حاصل ہوئی اس کے سلسلے میں ایک دلچسپ قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ وہ ایک جنگل کے اندر کسی غار میں پڑا ہوا تھا۔ "مجھے اب انگلینڈ کے بادشاہ سے مقابلہ کا خیال چھوڑ دینا چاہئے" اس نے سوچا۔ اس کو اپنی کامیابی کی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی۔ کئی بار کے مقابلہ کے بعد بالآخر وہ مایوس ہو چکا تھا۔

اتنے میں غار کے اندر ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا۔ ایک مکڑی اپنے جالے کے باریک تار سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑی۔ رابرٹ بروس کی نظریں اس کے اوپر جم گئیں۔ اس نے دیکھا کہ مکڑی نے اپنا ایک منٹ ضائع نہیں کیا اور لٹکتے ہوئے تار کے ذریعے دوبارہ اوپر چڑھنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ مگر چھت کے قریب پہنچتے ہی وہ دوبارہ پھسل کر گر پڑی۔ اب وہ پھر پہلے کی طرح زمین پر پڑی ہوئی تھی اس طرح وہ بار بار چڑھتی اور بار بار گرتی رہی۔ مگر وہ

ہمت نہیں ہاری اور ہر بار دوبارہ اسی کام میں مشغول ہو جاتی جس میں وہ اس سے پہلے ناکام ہو چکی تھی۔

رابرٹ بروس اس کے ناکام تجربات کو گنتا رہا۔ یہاں تک کہ جب وہ نویں بار زمین پر گری تو اس کو ہنسی آگئی۔ "اب یہ کیڑا مزید کوشش کی حماقت نہیں کرے گا" اس نے کہا۔ مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ مکڑی نے ایک لمحہ ٹھہرے بغیر دسویں بار پھر اپنی جدوجہد شروع کر دی۔

اس بار رابرٹ بروس کے سامنے دوسرا منظر تھا اس نے دیکھا کہ مکڑی منزل سے بہت قریب پہنچ گئی ہے وہ دھیرے دھیرے چڑھتی رہی یہاں تک کہ جب فاصلہ بہت قریب آگیا تو اس نے آخری چھلانگ لگائی اب وہ اپنے جالدار مکان کے اندر تھی۔

"خوب" رابرٹ بروس چلایا "وہ لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو ہمت نہ ہاریں اور مسلسل اپنی جدوجہد جاری رکھیں۔" وہ ایک لمحہ کے لئے رکا اور پھر بولا "ایک معمولی کیڑے نے مسلسل کوشش سے اپنی بازی جیت لی۔ پھر میں کیوں ایسا نہیں کر سکتا۔"

رابرٹ بروس غار سے نکل کر باہر آیا۔ اس نے آخری فیصلہ کن مقابلہ کے لئے تیاری شروع کر دی۔ وہ نئے عزم کے ساتھ شاہ انگلینڈ سے لڑا اور اس بار اس نے فتح حاصل کر لی۔

حقیقت یہ ہے کہ "میں ایسا نہیں کر سکتا" محض ایک بزدلانہ فقرہ ہے ہر شخص ہر کام کر سکتا ہے اور شکست دوبارہ نئی فتح میں تبدیل ہو سکتی ہے بشرطیکہ مسلسل جدوجہد کرنے کا حوصلہ پیدا ہو جائے۔

سیب کا سبق

ایک ٹن سیب سے کتنا عرق نکالا جا سکتا ہے۔ کوئی بھی پھلوں کا ماہر آپ کو بتائے گا کہ ۶۰ سے ۶۵ کلوگرام تک۔ مگر سیب میں حقیقتاً اس سے بہت زیادہ عرق ہوتا ہے۔ محققین نے دریافت کیا ہے کہ موجودہ ذرائع کے تحت جب ہم سیب کو مکمل طور پر نچوڑ چکے ہوتے ہیں، اس کے بعد بھی اس کے اندر ایک ٹن میں ۱۰۰ سے ۱۲۰ کلوگرام تک عرق باقی رہتا ہے۔

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے کولھو اچھے نہیں ہیں۔ نہیں۔ اگر ہم سب سے طاقتور برقی کولھو استعمال کریں جب بھی عرق کی مقدار میں بس برائے نام ہی فرق آئے گا۔ سیب کے اندر بچا ہوا عرق پھر بھی نہیں حاصل نہ ہو سکے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیب کے خلیوں کا چھلکا بے انتہا دباؤ کے تحت بھی ویسے کا ویسا ہی رہتا ہے۔ اور کولھو میں پس جانے کے باوجود اس کا عرق خلیوں کے اندر محفوظ رہتا ہے موجودہ حالت میں دباؤ اور طاقت کا اضافہ اس مسئلہ کو حل نہیں کرتا۔

یہ سیب کا قصہ ہے مگر اسی کے اندر آپ قوموں کی تصویر بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ایک قوم وہ ہوتی ہے کہ اگر وہ کسی دباؤ کی زد میں آجائے تو آخری حد تک نچڑ کر رہ جاتی ہے۔ مگر زندہ قوموں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اگر وہ ظلم و ستم کے کولھو میں پیل دی جائیں جب بھی سیب کی طرح، ان کے اندر زندگی کی رمق باقی رہتی ہے اور موقع پاتے ہی وہ دوبارہ اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔

اس کا اخبار وہاں بھی پہونچ رہا تھا جہاں وہ خود نہیں پہنچ سکتا تھا

روسی کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ کا ایک چھوٹا سا واقعہ ہے مگر اس کے اندر بہت بڑی نصیحت چھپی ہوئی ہے۔

یہ اس وقت کا ذکر ہے جب روس میں اکتوبر ۱۹۱۷ء کا انقلاب نہیں آیا تھا روس میں بالشویکوں (کمیونسٹوں کا قدیم نام) کے بڑھتے ہوئے اثرات کو روکنے کے لیے شہنشاہ روس (زار) نے بالشویک پارٹی کو خلاف قانون قرار دے دیا تھا۔ اور تمام بڑے بڑے لیڈروں کے نام گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیئے تھے۔

کچھ لیڈر گرفتار ہوئے، کچھ بچ کر جنگلوں اور غاروں میں روپوش ہو گئے۔ انھیں روپوش ہونیوالوں میں بالشویک پارٹی کا عظیم لیڈر لینین بھی تھا۔ لینن نے جنگلوں اور غاروں کے ایک دور افتادہ علاقہ کو اپنا مسکن بنایا اور وہاں روپوش ہو کر اخبار نکالنا شروع کر دیا۔ یہ اخبار دستی پریس میں چھاپ کر دستی طور پر روس کے شہروں میں خفیہ طور پر پہنچا دیا جاتا تھا۔

ایک روز کا واقعہ ہے۔ ایک شخص ایک روسی شہر میں پنساری کے یہاں کچھ سامان خریدنے گیا جب وہ سامان خرید کر گھر لایا اور پڑیا کھولی تو اچانک اس کی نظر پڑیا والے کاغذ کے چھپے ہوئے الفاظ پر پڑی۔ یہ ایک اخبار کا پھٹا ہوا صفحہ تھا جس میں آتشیں الفاظ اور گرما گرم عنوان کے ساتھ ایک عبارت چھپی ہوئی تھی۔

ردی کے اس ٹکڑے پر چھپی ہوئی عبارت پڑھ کر اس آدمی کے اندر عجیب کیفیت پیدا ہوئی، وہ بار بار اس کو پڑھتا رہا اور اس سے اپنے دل کو گرماتا رہا یہاں تک کہ اسے خیال ہوا کہ معلوم کرے کہ اس عبارت کا مصنف کون ہے اور یہ کس اخبار کا ٹکڑا ہے جو پنساری کی معرفت اسے ملا ہے۔

وہ تلاش میں لگ گیا۔ جوئندہ یابندہ۔ بالآخر اسے معلوم ہوا کہ یہ ردی کا ٹکڑا لینن کے اس اخبار کا پھٹا ہوا صفحہ ہے جو وہ روپوش ہو کر نکال رہا ہے۔

اب اس کا اشتیاق اور بڑھا اور وہ تلاش کرتا ہوا اس غار میں پہنچ گیا جہاں چھپ کر لینن اخبار نکالا کرتا تھا۔ اس کے بعد سے آخر تک وہ لینن کا ساتھی بنا رہا۔ اس طرح کے کتنے لوگ ہیں جن کو لینن نے صرف اپنے اخبار سے فتح کیا۔

لینن، زار کی پولیس سے بچنے کے لیے غار کے اندر روپوش تھا مگر اپنے اخبار کی بدولت وہ ہر شہر میں پہنچا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ بازار میں پنساری کی دکان بھی اس کے حق میں پروپیگنڈے کا مرکز بنی ہوئی تھی اس کا اخبار وہاں بھی پہنچ رہا تھا جہاں وہ خود نہیں پہنچ سکتا تھا۔

یہ ہے موجودہ زمانے میں پریس کی قوت۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ پچاس برس پہلے باشعور لوگوں نے اس سے جو کام لیا تھا ابھی تک ہم وہاں بھی نہیں پہنچے ہیں اور آج کی زندہ قومیں پریس سے جو کام لے رہی ہیں اس کی تو عام مسلمانوں کو خبر بھی نہیں حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں دوسری قومیں ہم سے اتنا آگے ہیں کہ ہم ان کے پیچھے بھی نہیں۔ پیچھے ہونے کا مطلب تو یہ ہے کہ ہم بھی کہیں ہیں۔ حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ ہم ان کی نسبت سے کہیں نہیں ہیں۔

جو بات ایک شخص اپنی ذات کے بارے میں جانتا ہے وہی بات قوم کے بارے میں بھول جاتا ہے

طرابلس کے متحف (میوزیم) میں ایک بکری رکھی ہوئی ہے جس کی گردن کے اوپر دو سر ہیں۔ اس کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے کہا، اگر ایک شخص اس کو دیکھ کر آئے اور آپ اس سے پوچھیں کہ سب سے عجیب چیز متحف میں تم نے کیا دیکھی۔ تو شاید وہ جواب دے گا کہ "دو سروں والی بکری"۔ مگر میں آپ سے کہتا ہوں کہ میں نے سب سے عجیب چیز جو دنیا میں دیکھی وہ دو سروں والے انسان ہیں۔ طرابلس کے متحف میں تو صرف ایک ایسی بکری ہے جس کے دو سر ہیں۔ مگر میں نے اپنی ساری عمر میں جتنے انسان دیکھے سب دو سر رکھنے والے انسان تھے۔

میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اس کو مثال سے سمجھئے۔

آپ کا ایک لڑکا ہے۔ آپ اس کو کامیاب ڈاکٹر دیکھنا چاہتے ہیں آپ کیا کریں گے۔ آپ اس کو اسکول میں داخل کریں گے۔ بیالوجی کے ساتھ ہائی اسکول کرائیں گے۔ پھر بی، ایس، سی کرائیں گے۔ پھر اس کو ایم بی بی ایس کے کورس میں داخل کریں گے۔ پھر آپ کی کوشش یہ ہوگی کہ اس کو ایف آر سی ایس کرنے کے لئے لندن بھیجیں۔ ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد ہی آپ یہ امید کر سکتے ہیں کہ وہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے دنیا میں اپنی جگہ بنائے۔ آپ میں سے کوئی شخص ایسا نہیں کرے گا کہ وہ اپنے لڑکے کو یوں ہی چھوڑ دے کہ وہ کھیلتا کودتا رہے۔ اس کے بعد جب وہ ۲۵ برس کا ہو جائے تو اس کا باپ اس کو ڈاکٹر بنانے کے حق میں پر جوش تقریریں شروع کر دے، وہ حکومت کو تار بھیجے کہ میرے لڑکے کو اسپتال میں سرجن مقرر کر دو۔ یا یہ کہ اس کو "پس ماندہ" قرار دے کر ڈگری کے بغیر ڈاکٹر تسلیم کر لو۔ آپ میں سے ہر شخص خوب جانتا ہے کہ ڈاکٹر بننے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا لڑکا تعلیمی اور تربیتی کورس کو پورا کرے۔ محض مطالبہ کرنے سے کوئی شخص کبھی ڈاکٹر نہیں بن سکتا۔ یہ دنیا استحقاق کی دنیا ہے، مطالبات کی دنیا نہیں۔

مگر یہی بات جو ہر آدمی اپنے ذاتی معاملہ میں جانتا ہے، قومی معاملہ میں وہ اس سے بے خبر ہے، جہاں کسی شخص کو قوم کا درد اٹھا اور وہ اصلاح کے میدان میں کھڑا ہوا، فوراً ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر ایک اور سر پیدا ہو گیا ہے جو بالکل دوسرے ڈھنگ سے سوچتا ہے۔ اب وہ "تیاری" کے بجائے "مطالبہ" کو کامیابی کا راز سمجھنے لگتا ہے۔ مفروضہ حریف کے خلاف پُر جوش تقریریں کرنا، تار اور میمورنڈم بھیجنا، مطالبات کے ریزولیوشن پاس کرنا، بین اقوامی اداروں میں اپنا کیس لے جانے کی اسکیمیں بنانا، یہی اس کی تمام سرگرمیوں کا خلاصہ ہوتا ہے۔ وہی شخص جو اپنی اولاد کے بارے میں جانتا تھا کہ کامیابی صرف اس طرح ملتی ہے کہ پہلے اس کے لئے صلاحیت اور استعداد پیدا کی جائے، وہی شخص قوم کی اولاد کے بارے میں اپنی ساری سرگرمیوں کا نقشہ اس طرح بناتا ہے گویا تقریر اور مطالبات ساری کامیابیوں کا راز ہیں۔ یہ لاحاصل جد وجہد بالآخر جب ناکام ہو جاتی ہے تو وہ ہمت نہیں ہارتا۔ اب وہ اپنی مطالباتی مہم کو جاری رکھنے کے لئے نیا لفظ ڈھونڈ لیتا ہے:
"ہم کو پس ماندہ قرار دے کر استحقاق کے بغیر ہی تمام مناصب پر بٹھا دو۔" ایسے لوگوں کو اس کے سوا کیا کہا جائے کہ وہ دو سر رکھنے والے لوگ ہیں۔

اس مزاج کے معاملہ میں کسی مسلم قوم کی کوئی خصوصیت نہیں۔ ہر علاقہ کے مسلمان اسی دُہری ذہنیت کا شکار ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کسی کا "دوسرا سر" ایک کے خلاف کام کر رہا ہے، کسی کا دوسرے کے خلاف۔ **ایسے لوگ ممکن ہے وقتی لیڈری حاصل کر لیں مگر ان کے اس عمل کی کوئی قیمت نہ تاریخ کے نزدیک ہے اور نہ خدا کے نزدیک۔**

سوچ کر زندگی گزاریئے

حافظ حامد حسن علوی (۱۹۵۹ - ۱۸۶۲) اعظم گڑھ کے ایک بزرگ تھے۔ نہایت ذہین اور معاملہ فہم۔ انکے عزیزوں میں ایک شخص اکثر گھر کے اندر عورتوں اور بچوں میں بیٹھا کرتے تھے۔ حافظ صاحب مرحوم نے جب کئی بار ان کو اس طرح دیکھا تو ایک روز بگڑ کر فرمایا: "عورتوں میں مت بیٹھو، اس سے عقل کم ہو جاتی ہے"۔

یہ مقولہ حال میں مجھے اس وقت یاد آیا جب میں نے ایک نوجوان کو دیکھا۔ وہ اس سے پہلے ایک معمولی ملازمت میں تھے۔ پچھلے دو برس سے انھوں نے ملازمت چھوڑ کر ایک کاروبار کر لیا ہے۔ جب میں ان سے ملا تو مجھے محسوس ہوا کہ ان کے کل اور آج میں بہت بڑا فرق ہو چکا ہے۔ ملازمت کے زمانے میں وہ دبے اور کھنچے ہوئے شخص دکھائی دیتے تھے۔ بہت کم کوئی سمجھ داری کا جملہ ان سے سننے میں آتا تھا مگر اب جو میں نے دیکھا تو ان کے اندر ایک اعتماد ابل رہا تھا۔ اور بات بات میں سمجھ داری کی باتیں ان کی زبان سے نکل رہی تھیں۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ آدمی جیسی زندگی گزارتا ہے، اسی کے لحاظ سے اس کی عقل کی تربیت بھی ہوتی ہے۔ جو شخص عورتوں اور بچوں میں اپنا وقت گزارے ظاہر ہے کہ اس کی گفتگو کے موضوعات بالکل معمولی ہونگے۔ گھریلو قصے، فیشن، ہنسی مذاق، کھانا، کپڑا وغیرہ۔ اس قسم کی باتوں میں مشغول رہنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا ذہن اونچے اور گہرے مسائل میں غور و فکر کی تربیت نہیں پاسکے گا۔ اسی طرح ملازم کی زندگی ایک لگی بندھی زندگی ہوتی ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح مہینہ پورا کرلے تو اس کو مقررہ تنخواہ بہر حال مل جائے گی۔ اس زندگی کی وجہ سے اس کے اندر ایک قسم کا ذہنی ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس تجارت ایک ایسا کام ہے جس میں ہر وقت آدمی کی محنت اور صلاحیت کا امتحان ہوتا رہتا ہے۔ ہر دن اس کو نئے نئے حالات سے نمٹنا پڑتا ہے یہ چیز حالات سے لڑنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ اس کی عقل کو جلا دیتی ہے اس کو بار بار زندگی کی خوراک دیتی رہتی ہے۔

آدمی کو چاہیئے کہ اپنی زندگی کا مشغلہ طے کرتے وقت یہ ضرور سوچے کہ وہ اسکی زندگی کی تربیت کس طرح کرے گا۔ وہی مشغلہ ایک انسان کے لیے صحیح مشغلہ ہے جس میں اس کی چھپی ہوئی صلاحیتیں ابھریں، اس کے ذہن کا افق وسیع ہو، اس کے اندر خود اعتمادی کی پرورش ہو سکے، وہ دنیا میں وہ تمام "رزق" پاسکے جو خدا نے یہاں اس کے لیے مہیا کر رکھا ہے۔

انسانی ذہن حیران کن حد تک بے پناہ صلاحیتیں رکھتا ہے۔ اگر ہم درست مشغلہ اختیار کریں تو ہمارے ذہن کی ترقی ہماری زندگی کی آخری سانس تک جاری رہیگی، اس کے امکانات کبھی ختم نہ ہوں گے۔ اس کے برعکس اگر ہم اس کو کسی محدود یا ناقص مشغلہ میں بند کر دیں تو وہ ٹھٹھر کر رہ جائے گا۔ پانی ایک گڑھے میں ہو تو وہ گھٹ کر رہ جاتا ہے، مگر وہی پانی جب دریا میں رواں ہوتا ہے تو سیلاب بن جاتا ہے۔

بھگوتی ایس۔ گڈوانی ہندستان کے شہری پرواز کے محکمہ کے ڈائرکٹر جنرل ہیں۔ انھوں نے اپنی ایک تازہ کتاب میں میسور کے سلطان ٹیپو (۹۹-۱۷۵۱) کے حالات ناول کے پیرایہ میں بیان کئے ہیں۔ اس تاریخی ناول کا نام ہے "ٹیپو سلطان کی شمشیر"۔ یہ کتاب انھوں نے ہند، برطانیہ، فرانس، ہالینڈ، ترکی اور ایران کے کتب خانوں اور عجائب گھروں میں اٹھارہ سال تک تحقیق کرنے کے بعد تیار کی ہے۔

مسٹر گڈوانی نے ٹیپو سلطان کو "درجہ اول کا قوم پرست" قرار دیا ہے۔ ان کا فیصلہ ہے کہ "ٹیپو اٹھارویں صدی کا واحد ہندستانی حکمراں ہے جس نے کسی بھی وقت اپنے ہم وطنوں کے خلاف جنگ میں انگریزوں کا ساتھ نہیں دیا۔"

مسٹر گڈوانی نے لکھا ہے کہ "۱۷۹۲ کے سرنگاپٹم کے محاصرہ میں ٹیپو نے انگریزوں کے ساتھ صلح کی جو بات چیت شروع کی وہ محض اپنے جنرل میر صادق کی پیدا کردہ غلط فہمی کی بنیاد پر تھی۔ حالانکہ اس وقت برطانوی جنرل کارنوالس اپنی فوجوں کے زبردست جانی نقصان کی وجہ سے پسپائی کی تیاریوں میں مشغول تھا۔"

سلطان ٹیپو کا یہ اقدام وقتی طور پر اس کے جاسوسی نظام کی کمی کا سبب ہو سکتا ہے۔ تاہم ٹیپو کی شکست یا اٹھارویں صدی کے آخر میں مشرقی اقوام کی مغربی اقوام کے مقابلہ میں پسپائی اس قسم کی کسی جزدی یا اتفاقی غلطی کا نتیجہ نہ تھی۔ یہ دراصل جدید قوتوں میں مغرب کی سبقت اور مشرق کی پس ماندگی تھی جس نے ایک کو غالب اور دوسرے کو مغلوب کر دیا۔

تاریخ میں کوئی فیصلہ دینا ایک بے حد نازک کام ہے۔ کیوں کہ بہت سے بظاہر یکساں اسباب میں سے کسی ایک سبب کو وہ فیصلہ کن عامل قرار دینا پڑتا ہے جس کے ذریعہ دوسرے اسباب کو سمجھا جا سکے۔ اگر فیصلہ کن سبب کو متعین کرنے میں غلطی ہو جائے تو تاریخ کا مطالعہ محض قصہ کہانی کا مطالعہ بن جاتا ہے بجائے اس کے کہ وہ ہم کو کسی حقیقی سبب تک پہنچانے کا ذریعہ بنے۔ اپنی کمزوری کو دوسرے کے اوپر ڈالنے کی کوشش آدمی کو تاریخ کے حقیقی سبق سے محروم کر دیتی ہے۔

عام تصور یہ ہے کہ کسی "قدیم" تہذیب کو دوبارہ "جدید" نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح آدمی کو جوانی صرف ایک بار ملتی ہے، اسی طرح تہذیب کو بھی صرف ایک بار عروج نصیب ہوتا ہے۔ اس کے بعد تہذیب پر بڑھاپا آجاتا ہے۔ اور جو بوڑھا ہو گیا اس کو دوبارہ جوان نہیں کیا جاسکتا۔

مگر چین کی مثال نے اس مفروضہ کی تردید کر دی ہے۔ نیویارک ٹائمز کے نامہ نگار جیمز ریسٹن (JAMES RESTON) نے پیکنگ میں اپنے طویل قیام کے بعد اپنے ذاتی مشاہدہ پر مبنی ایک رپورٹ تیار کی ہے جس کا عنوان ہے

NEW LOOK OF AN ANCIENT LAND

اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ "چین کی قدیم ترین تہذیب کے بارے میں جو بات سب سے زیادہ نمایاں ہے، وہ یہ کہ آج وہ دوبارہ جوان نظر آتی ہے۔ ایک امریکی مشاہد کے نزدیک چین کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اس کا "شباب" ہے۔